دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

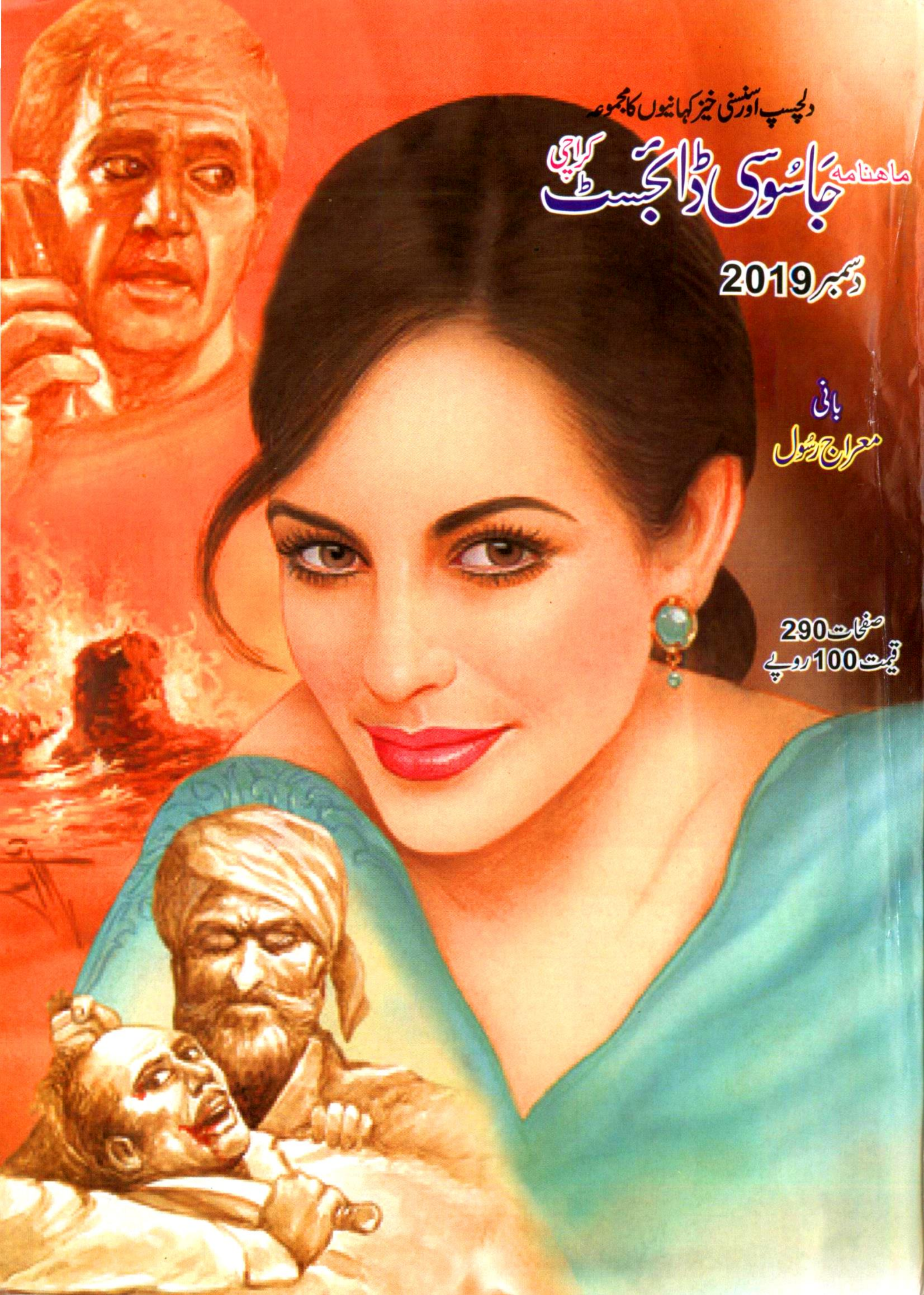
ماھنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

دسمبر 2019

بانی
معراج رسول

صفحات 290
قیمت 100 روپے



جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS — CPNE

مدیر اعلیٰ

عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 49 • شمارہ 12 • دسمبر 2019 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مدیراعلیٰ

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

سالِ رواں کا آخری شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ الحمدللہ، اگلے ماہ آپ کے محبوب پرچے کی مسلسل اشاعت کا پچاسواں سال شروع ہوجائے گا۔ یہ آپ کی پسند، محبتوں اور سرپرستی کا ثمر ہے کہ یہ سنگ میل بھی آپہنچا ہے۔ دسمبر پاکستانیوں کے لیے قائداعظم کے یوم پیدائش کی یاددہانی لیے آتا ہے تو دوسری طرف مسیحی بھائیوں کے لیے کرسمس کی خوشیاں لاتا ہے۔ دونوں حوالوں سے سب کی خدمت میں دلی مبارک باد۔ ہم کو انگریز کے تسلط سے آزاد ہوئے 72 برس گزر چکے ہیں مگر تعلیم اور صحت کے شعبوں میں ہماری کارکردگی انتہائی مایوس کن ہے۔ یہ کیسی ہولناک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا کوئی معیاری اسپتال آج تک قائم نہیں کیا جاسکا جہاں پیچیدہ امراض کا علاج تو درکنار، اس کی صحیح تشخیص تک ہوسکے۔ پورے ملک میں گنتی کے چند لاکھ افراد ہوں گے جو یہ استطاعت رکھتے ہوں کہ ذاتی خرچ پر بیرونِ ملک علاج معالجے کی سہولت حاصل کرسکیں۔ رہے عام لوگ تو ان کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ان کے لیے ادھوری علاج گاہیں اور روایتی مسیحا موجود ہیں۔ پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہونے والے بے مایہ لوگوں کے لیے یہیں سسک سسک کر زندگی پوری کرنا مقدر بن گیا ہے۔ انتہا ہے کہ سگ گزیدہ افراد کے لیے اسپتالوں میں ویکسین نایاب ہے۔ ملتی بھی ہے تو بروقت نہیں ملتی۔ وقت کے ساتھ علاج معالجہ اس قدر مہنگا ہوچکا ہے کہ عوام کی دسترس سے باہر ہے۔ ہمارے درمیان مخیر اور دردمند پاکستانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ادیب رضوی کا SIUT اور لاہور کا شوکت خانم کینسر اسپتال ایسے ہی لوگوں کی مالی سرپرستی سے چل رہے ہیں...... کیا یہ ممکن نہیں کہ امریکا، برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا لوہا منوانے والے پاکستانی ڈاکٹرز کی مشاورت اور مدد سے ملک کے کسی بھی حصے میں ایک ایسا جدید جنرل اسپتال قائم کیا جائے، جہاں ہر شاہ و گدا کو بلا کسی امتیاز و تخصیص رسائی کا حق حاصل ہو، تشخیص اور علاج کے لیے اعلیٰ درجے کی سہولیات دستیاب ہوں، اخراجات واجبی اور قابلِ برداشت ہوں...... نادار مریضوں کو سرکاری بیت المال سے علاج کے لیے وسائل مہیا کیے جائیں۔ یہ سب ہوسکتا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔ پہلے جنرل اسپتال کے بعد ہر صوبے، ہر شہر اور پھر ہر بستی میں صحت عامہ کے ایسے مثالی ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ شرط صرف جذبے، نیت اور ہمت کی ہے۔ شدید مسابقت کے اس دور میں عالمی منظرنامے پر وہی قومیں اپنا وجود منوا سکتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ صحت منداور توانا بھی ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ نئے سال میں اس سمت میں کیا پیش رفت ہوتی ہے۔ ہماری پیش رفت اب آپ کی طرف ہے۔ جہاں پھول اور کانٹے، سب ہی ہمارے منتظر ہیں۔

رحیم یار خان سے نوید ظفر کی امید ''ٹائٹل اس بار انتہائی خوب صورت تھا۔ خاص کر حسینہ کی صاف و شفاف بھوری آنکھیں، تیکھی ناک، سرخ رسیلے ہونٹ جن کو سرخ کرنے کے لیے غالباً حسینہ کو سخت محنت کرنا پڑی ہوگی۔ میک اپ زدہ چہرہ، خوبصورت وگ اور چوڑے شانوں پر کسا ہوا لباس، ذاکر انکل نے غالباً یہ تصویر آج کل کی فیشن زدہ لڑکیوں کو دیکھ کر بنائی ہوگی کیوں کہ حسینہ انتہائی فیشن ایبل اور خوبصورت تھی۔ لگتا ہے گروپ کی خواتین نے اس حسینہ کو مرد قارئین جاسوسی کو دھوکا دینے کے لیے اتارا ہے۔ ایسا لگا حسینہ میٹھی نظروں سے مجھے ہی پکار رہی تھی۔ حسینہ کے پہلو میں عجیب خلائی مخلوق کھڑی تھی۔ ہاتھ میں گن لیے یہ مخلوق مجھے حسینہ سے دور رہنے کو کہہ رہی تھی۔ سائڈ والے دھان پان سے بندے کو تو حسینہ کے زیادہ قریب آنے پر فائر بھی مار چکی تھی۔ خطرہ دیکھ کر ہم بھی وہاں سے کھسک کر نکتہ چینی دان میں کود پڑے۔ (یہ اچھا کیا!) اس مرتبہ ذیشان حیدر کاظمی وکٹری اسٹینڈ پر بیٹھے لالی پاپ کھا رہے تھے۔ یار کاظمی بھائی، ذرا یہ تو چپکے سے بتانا کہ آپ اتنا اچھا تبصرہ کیسے لکھ لیتے ہو، میں تو گھنٹوں سوچنے کے بعد الاؤ پر مشکل سے تبصرہ لکھ پاتا ہوں۔ محمل علی اور ایمانے زارا کے تبصرے زبردست تھے۔ ایمانے زارا شاہ کی دھمکی پڑھ کر تو بے ساختہ قہقہے نکلنے لگے۔ میرے فیورٹ ریاست علی کا تبصرہ بھی ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھا لیکن اس بار ادھورا سا محسوس ہوا۔ میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات کا شکریہ قبول فرمائیں۔ مومنہ کشف کی نوک جھوک اچھی لگی۔ سڈنی کے ڈاکٹر ارسلان کا تبصرہ بھی دلچسپ رہا۔ میں بھی ان کی تائید کروں گا کہ اقلیم علیم سے جلد کچھ لکھوائیں۔ میرے پسندیدہ رائٹر جناب کاشف زبیر صاحب جب سے الاؤ کا تحفہ لے کر جاسوسی میں آئے ہیں، دل خوش ہوگیا ہے۔ اتنی اچھی کہانی پیش کرنے پر بہت شکریہ۔ پچھلے چند ماہ سے جاسوسی میں جو خلا محسوس ہو رہا تھا، اس خلا کو الاؤ نے ختم کردیا ہے۔ کاشف زبیر نے لاہور کے ماحول کو بڑے خوب صورت انداز سے تحریر کیا ہے۔ مجھے اپنا اسٹوڈنٹ زمانہ یاد آگیا۔ لاہور اب بہت پھیل گیا ہے اور کہانی میں جیسے بیان کیا جارہا، اس سے کچھ بدل بھی گیا ہے۔ طارق تو کلاشنکوف اٹھا کر ڈھشوں ڈھشوں کرتا رہا۔ امید ہے کہ ڈاکٹر سیف بھی سنگل پسلی سے ہیرو بننے کے بعد بڑے بڑے سورما ٹائپ فش کریں گے۔ آوارہ گرد تو ایسا لگتا ہے آتش فشاں کی کاربن کاپی کی جارہی۔ وجدان جیسے ساحل کی تلاش میں ہنگامہ آرائیاں کرتا رہا ویسے ہی شہزی عابدہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ساحل جب وجدان کو ملی تھی تو کہانی ختم ہوگئی تھی۔ اب لگتا ہے کہ آوارہ گرد کا بھی اختتام آن پہنچا ہے۔ رنگوں میں اس بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آزار شناسائی تو پھر بھی غنیمت رہی لیکن فریب

تعلقِ جاں سوز

اسما قادری

خفّت... ہزیمت... اور ندامت کے چھینٹوں سے دامن کو بے داغ رکھنا ہی اصل بہادری ہے... لیکن جب جذبات کی تیز آندھی چلتی ہے تو آنکھوں میں مٹی بھر جاتی ہے... سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں مفقود ہو جاتی ہیں... بس نظر جو دیکھتی ہے... وہ سچائی میں ڈھل جاتا ہے... ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی سنگین و رنگین داستان کی فریب کاریاں... ایک دوسرے سے مضبوط رشتوں میں بندھنے کے باوجود اُن کے مابین تعلقات کی سرد مہری طاری تھی... وفائوں کے لبادے میں ہر شخص جفاگزیدہ تھا... ہر ایک کی زندگی میں محبت نچھاور کرنے والے دعوے دار اپنا کردار نبھا رہے تھے... مگر تعلقِ جاں سوز نے دل کو گرفتگی اور تِشنگی میں مبتلا کر رکھا تھا...

رگِ جاں میں اتر جانے والے محبت کے گھاؤ

جو لمحہ بہ لمحہ موت سے ہمکنار کر رہے تھے

سماعتوں کو مفلوج کر دینے والے بارش کے شور کے ساتھ دیوانی ہو جانے والی ہوا نے ساز باز کر کے بڑا دہشت ناک منظر تخلیق کر دیا تھا۔ سالوں سے سینہ تانے سیدھے کھڑے رہنے والے اونچے درخت ہوا کی دیوانگی کے آگے بے بس ہو رہے تھے تو بند کھڑکیاں منہ زور ہواؤں کو اندر داخل ہونے سے روکنے کی جدوجہد میں یوں شور مچاتی تھیں جیسے کئی بلائیں ایک ساتھ مل کر چیخ رہی ہوں۔ اس قیامت خیز شور پر گاہے گاہے ہونے والے دھماکوں کی آوازیں سب سے زیادہ غالب تھیں۔ یہ دھماکے کسی ہورڈنگ کے گرنے، کسی درخت کے جڑ سے اکھڑ جانے، کسی دیوار کے ڈھے جانے جیسے عوامل کی وجہ سے ہو رہے تھے۔ ہر دھماکے پر سننے والوں کے دل دہل جاتے تھے جسبِ روایت بجلی نے بارش کے ساتھ اپنا ازلی کردار نباہنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا اور آسمان سے ابتدائی چند بوندیں زمین پر گرتے ہی بجلی یوں غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس پورے ہنگامے میں اگر کہیں سکون اور ٹھہراؤ نظر آتا تھا تو ''قصرانا'' کی شاندار اور مضبوط عمارت پر۔ اس طوفانی بارش نے ''قصرانا'' کا گویا کچھ بگاڑا ہی نہیں تھا اور قصر کی شاندار عمارت پوری شان سے سر

اٹھائے یوں بارش میں بھیگ رہی تھی جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ رم جھم میں اٹکھیلیاں کررہی ہو۔ برقی رو معطل ہونے کا بھی قصر پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور طاقتور جنریٹر نے قصر کی ہر بتی کو روشن کررکھا تھا۔ بادی النظر میں دیکھا جاتا تو اس طوفانی رات میں قصر اور قصر کے مکین ہر قسم کے اندیشے، پریشانی، فکر اور غم سے آزاد مکمل حالت سکون میں تھے لیکن یہ صرف مخدوم وجاہت علی ہی جانتے تھے کہ ان کی ہستی ایک ایسے طوفان سے دوچار ہے جس کے آگے باہر جاری طوفان کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے جہانگیر کہ کہیں کوئی غلطی، کوئی بھول چوک نہیں ہوئی ہے؟'' بہت دیر تک ساکت رہنے کے بعد انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے یوں پوچھا جیسے طوفان کی زد میں آیا شخص ہاتھ پیر مار کر ایک بار، ایک آخری بار اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کررہا ہو۔

''غلطی اور بھول چوک کی گنجائش چھوڑ کر میں آپ تک اتنی اہم اطلاعات پہنچانے کی ہمت کیونکر کرسکتا تھا بھائی جان۔'' جہانگیر نے مکمل ادب کے ساتھ ان کی بات کا جواب دیا۔

''ہم تمہاری ذمے دار طبیعت سے واقف ہیں لیکن دونوں ہی اطلاعات اتنی نازک اور تکلیف دہ ہیں کہ ہم خود کو ان پر یقین کرنے کے لیے آمادہ نہیں کر پارہے۔'' وہ جن کا رعب داب مقابل کو ان سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرنے دیتا تھا، اس وقت بے حد بے بس نظر آرہے تھے۔

''مجھے آپ کی تکلیف کا اندازہ ہے بھائی جان لیکن سب کچھ جان کر میں آپ کو اندھیرے میں رکھنے کی گستاخی بھی تو نہیں کرسکتا تھا۔'' جہانگیر کے چہرے کے تاثرات میں بھی کرب کی آمیزش تھی۔

''تم نے ہمیں بتا کر غلط نہیں کیا لیکن افسوس کہ ہمیں یہ سب بہت تاخیر سے معلوم ہوا۔ اب اس مرحلے پر ہم کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں ہیں۔'' وجاہت علی نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں بھائی جان! آپ جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ آپ مشکل سے مشکل حالات سے بھی نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟'' جہانگیر کی آنکھوں میں حیرت جھلکی۔

''تمہارے خیال میں ہم ان حالات میں کیا کرسکتے ہیں؟''

''جو کچھ کل ہونے جارہا ہے، کم از کم اسے تو روک ہی سکتے ہیں۔'' جہانگیر کی تجویز کے جواب میں وجاہت علی نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''ہم اپنی جگ ہنسائی نہیں کرواسکتے۔ اس کا حوصلہ کر بھی لیں تو اپنے بیٹے جیسے بھائی کو دکھ دینے کا حوصلہ نہیں کرسکتے۔ تم جانتے ہو وہ بے حد خوش ہے۔ اس کی خوشی چھین کر اسے تلخ حقائق کے کرب میں مبتلا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔''

''حقائق کو آج نہیں تو کل کھلنا ہی ہے۔''

''ہمیں اس بات سے انکار نہیں لیکن آج...... نہیں...... آج ہم کوئی سچ نہیں بول سکتے۔ ہمارا بھائی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہا ہے۔ آج بولا جانے والا سچ بے حد کربناک ہوگا۔ آج اسے اس کی زندگی جی لینے دو جہانگیر...... آنے والا کل خود اس کے اندر تلخیاں سہنے کا حوصلہ پیدا کردے گا۔'' بالآخر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''جو آپ مناسب سمجھیں بھائی جان۔'' جہانگیر نے اُن سے اختلاف نہ کرکے اپنی تابعداری کا ثبوت دیا۔

''رات کافی ہوگئی ہے۔ اب ہم آرام کریں گے۔ تم بھی گیسٹ روم میں جاکر آرام کرو۔'' وجاہت علی نے محفل برخاست ہونے کا عندیہ دیا۔

''شکریہ بھائی جان لیکن میں آپ سے جانے کی اجازت چاہوں گا۔''

''اتنے خراب موسم میں کیسے جاؤ گے؟'' انہوں نے شفاف شیشے سے باہر برستی بارش اور آسمان پر کوندتی بجلیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

''میرا صبح ڈیوٹی پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ معاملہ اتنی اہم نوعیت کا نہ ہوتا تو میرے اس موسم میں یہاں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اب واپس جانا بھی مجبوری ہے۔'' جہانگیر نے شانے اچکائے۔ کچھ دیر میں وہ روانگی کے لیے بالکل تیار نظر آرہا تھا۔

''گاڑی احتیاط سے چلانا جہانگیر، اس وقت راستوں پر شدید پھسلن ہوگی۔'' وجاہت علی نے بے ساختہ ہی نصیحت کی۔

''آپ بے فکر رہیں بھائی جان۔ میں محتاط رہوں گا۔'' جہانگیر نے انہیں تسلی دی اور مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تو وجاہت علی میز پر رکھی اس قیامت کو دیکھتے رہے جس نے زندگی کے نہایت خوش کن موڑ پر ان کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیے تھے اور حقیقتاً وہ



تحفظ

تنویر ریاض

ایک طویل عرصہ ساتھ گزارنے کے بعد ایک دوسرے سے انسیت اور اپنائیت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے... رفتہ رفتہ ساتھ کام کرنے والے کولیگ میں خوشیوں اور دکھوں کی باتوں کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا ہے... ایک طرح سے وہ ایک دوسرے کو تحفظ کا احساس دلاتے ہیں کہ بُرے وقت میں گھبرانا نہیں... ایسے ہی احساسات اور جذبوں سے گندھی دل گداز تحریر...

[illegible] میں تو ایک چنگاری [illegible] بھڑکا دیا تھا

سرخ اینٹوں سے بنے ہوٹل کے در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ ہوٹل سینٹرل ایونیو اور بیالیسویں اسٹریٹ کے کونے پر واقع ہے۔ یہ لاس اینجلس کے مرکز سے زیادہ دور نہیں ہے، اس وقت اس سڑک پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ دو سفید فام اسپتال کے ملازمین ایک اسٹریچر پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش کو لے کر ہوٹل سے باہر آئے اور سیاہ فام ہجوم میں سے گزرتے ہوئے ایمبولینس کی جانب بڑھے جو ہوٹل کے برابر کلب کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''یہ کس کی لاش ہے؟'' ایک راہ گیر نے اسٹریچر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ یہ کنگ کری ہے۔''

''کنگ کری؟'' راہ گیر نے بے یقینی سے کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔'' وہ کنگ کری کا پرستار تھا اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا محبوب فنکار اچانک ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

☆☆☆

ڈنبار ہوٹل آج بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے کھڑا تھا۔ صحرائی ہواؤں کے تھپیڑے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ ممکن ہے کہ گردشِ زمانہ نے اس کی ظاہری شکل و صورت کو کچھ متاثر کیا ہو لیکن وہ اب بھی باہر سے آنے والوں کے لیے ایک پسندیدہ رہائش گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اس تیز، گرم اور خشک ہوا میں ٹریور شارپ ڈنبار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''لعنت ہے۔ جنوری کے مہینے میں بھی اتنی گرم ہوا چل رہی ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کیونکہ جب اس نے کار پارک کی تو اس کے آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے کار سے باہر نکل کر ہوٹل پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ اس ہوٹل کے علاوہ کوئی اور پرانے وقتوں کی یادگار اس شہر میں باقی رہ گئی ہے؟ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس ہوا کے ساتھ اُڑنے والے ریت کے ذرات بھی ویسے ہی ہیں جو کئی برس پہلے یعنی 1947ء میں تیز ہوا کے ساتھ اس سڑک سے گزر رہے تھے۔

جھکڑ بھٹی کے مانند چلنے والی ہوا نے اس کی جلد کو خشک اور کھردرا بنا دیا تھا لیکن اس کا موازنہ غصے کی اس لہر سے نہیں کیا جاسکتا تھا جو اس ہوٹل کی تاریخ کے بارے میں جان کر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔ اس ہوٹل میں سیاہ فام امریکی قیام کرتے تھے کیونکہ انہیں لاس اینجلس میں کسی اور جگہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔

شارپ، لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا پھر اس نے بغل میں دبے ہوئے فولڈر کو چھوا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ موجود ہے یا نہیں پھر وہ لابی میں داخل ہوا۔ وہ دیکھنے میں ویسی ہی تھی۔ تاہم 1930ء اور 1940ء میں کھینچی گئی ہوٹل کی تصاویر سے قدرے مختلف تھی۔ اس کی ہوادار اور روشن کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے ذریعے باہر کی گرم ہوا اندر آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں اب بھی ماضی کے موسیقاروں ڈیوک اینگلٹن اور کیب کالووے کی موسیقی گونج رہی تھی۔ اس نے دو منزلہ لابی کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں قدیم طرز کی محرابوں اور دیوار پر کی گئی نقاشی کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ خود بھی پرانے دور میں پہنچ گیا ہے جب یہ ہوٹل اپنے جوبن پر تھا لیکن یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی پھر اس نے کاؤنٹر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' سفید قمیص اور سیاہ پتلون میں ملبوس ایک نوجوان ہسپانوی شخص نے کہا۔

اب اس علاقے میں صورتِ حال تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے اس جگہ کو لاس اینجلس میں سیاہ فام افراد کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی لیکن اب یہاں دوسری قوموں کے افراد بھی نظر آنے لگے تھے۔

''میں فلیچر ریورز کو تلاش کر رہا ہوں۔''

کلرک نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔ ''اور تم کون ہو؟''

اسے کلرک کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ گاہکوں سے بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا پھر وہ اپنے آپ کو کوئی توپ چیز سمجھ رہا تھا۔ شارپ اسے کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا لیکن اس نے اپنی زبان کو روک لیا اور جیب سے لاس اینجلس ٹائمز کا شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

کلرک نے کھڑکی کے برابر میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ شخص کی طرف اشارہ کیا جس کے سر کے بال تقریباً سفید ہوچکے تھے اور اس نے ایک نیا براؤن رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا اخبار تھا اور اس کے برابر میں ایک پرانے طرز کا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔

''مسٹر ریورز؟'' اس نے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

بوڑھے شخص نے اخبار پر سے نظریں ہٹائیں اور بولا۔ ''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ٹریور شارپ، میرا تعلق لاس اینجلس ٹائمز سے ہے۔ میں ایک پرانے کیس پر ریسرچ کر رہا ہوں جو کنگ کری، جارجیا ہالے، کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے تم سے اس کیس کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔ امید ہے کہ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے۔''

''یہ تو بہت پرانا کیس ہے اور اسے بند ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ اب میں مختلف زندگی گزار رہا ہوں۔''

''اس وقت تم پولیس میں تھے؟''



علاج

منظر امام

مرض لاحق ہو جائے تو علاج ضروری ہو جاتا ہے... بعض مریض اپنی نوعیت کے انوکھے مرض میں ہی مبتلا ہوتے ہیں... جوں جوں دوا کی... مرض بڑھتا گیا... ایسے مفلوک الحال ماحول سے جُڑی کہانی... ایک بے ضرر شخص کو زور آور مل گیا تھا...

بوجھل لمحوں کو خوشگوار کردینے والی پرمزاح تحریر......

بنّے خان کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ میں ایک مفلوک الحال انسان ہوں۔

نہ جانے کیوں؟ کیا سوچ کر میں اس کے دفتر میں داخل ہوگیا تھا۔ وہ ایک شادی دفتر تھا۔ زیادہ عالی شان نہ سہی پھر بھی ایک غنیمت دفتر تھا۔

بنّے خان ایک صحت مند بڑی بڑی مونچھوں والا انسان تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا دیا۔ ایسی مسکراہٹ صرف تاجروں کے پاس ہوا کرتی ہے۔

’’تشریف رکھیں جناب۔ اس دفتر کو آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

’’میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔‘‘

’’آپ رشتے کے لیے آئے ہیں نا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’جی جناب۔‘‘ میں نے گردن ہلادی۔

’’وہی تو میں عرض کر رہا ہوں۔ آپ جیسی پرسنالٹی بہت کم آیا کرتی ہے۔ ہوتا یہ ہے جناب کہ عام طور پر بے ڈھنگے اول جلول لوگ آیا کرتے ہیں۔ جو خود تو چاہے جیسے ہوں لیکن شادی کے لیے انہیں حسینۂ عالم کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

’’لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف ہے جناب۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے کسی حسینہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بس لڑکی ذرا سلیقے کی ہو۔‘‘

’’آپ اپنے بیٹے سے تو پوچھ لیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’انہیں کیسی لڑکی چاہیے۔‘‘

’’بیٹے سے کیا پوچھوں؟ میں تو خود اپنے رشتے کے لیے آیا ہوں۔‘‘ میں نے بتایا۔

’’اوہو، اپنے رشتے کے لیے؟‘‘ اس نے طنز سے پوچھا۔

’’جی جناب۔‘‘

’’اور آپ کو لڑکی بھی خوب صورت چاہیے ہوگی؟‘‘

’’یہ تو خیر اس کی اضافی خوبی ہوگی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن پیسے والی ضرور ہو۔‘‘

’’کیا مطلب ہے آپ کا؟‘‘ وہ چونک گیا۔

’’بس جناب ایسی ہو کہ اس کے پیسوں سے اپنا کاروبار شروع کرسکوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اوہو، تو آپ کوئی کام نہیں کرتے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’میں نے عرض کیا نا جناب کہ رشتہ ہو جائے تو پھر کاروبار شروع کردوں گا۔‘‘

’’آپ کی تعلیم کیا ہے جناب؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’خیر وہ تو بہت اچھی ہے۔ بی اے کر چکا ہوں۔‘‘

’’کمال ہے، آج کے دور میں آپ بی اے کو بہت اچھی تعلیم کہہ رہے ہیں؟‘‘

’’میرا تعلق اس خاندان سے ہے جس میں میٹرک ہونا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔‘‘ میں نے بتایا۔

’’واہ واہ!‘‘ بنّے خان جھوم اٹھا۔ ’’کیا کہنے ہیں۔ آپ جیسے لوگ ذرا کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔‘‘

’’ارے جناب، ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔‘‘ میں نے انکساری سے گردن جھکا دی۔

’’آپ فرمائیں، ایسا کوئی رشتہ ہے آپ کے پاس؟‘‘

’’مجھے ذرا سوچنے دیں۔‘‘ اس نے ہنکار... بھری۔ پھر کچھ یاد کر کے بولا۔ ’’جی ہاں ایسا ایک رشتہ ہے میرے پاس۔ میرا خیال ہے کہ وہاں آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ پہلے یہ بتائیں مکان آپ کا اپنا ہے؟‘‘

’’نہیں جناب۔ اپنا مکان کہاں سے ہونے لگا؟‘‘

’’تو پھر کرائے کے مکان میں رہتے ہوں گے؟‘‘

’’نہیں جناب۔ کرایہ ادا کرنے کی ہمت کہاں ہے؟‘‘

اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ ’’تو پھر کہاں رہتے ہو؟ کیا فٹ پاتھ پر؟‘‘

’’اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں۔ اپنے ایک دوست کے گھر رہتا ہوں۔ کئی مہینے ہو گئے۔ اب تھوڑی پرابلم ہونے لگی ہے۔‘‘

’’کیسی پرابلم؟‘‘

’’اس کی بیوی شور کرنے لگی ہے کہ یا تو وہ مجھے گھر سے نکال دے یا اسے طلاق دے دے۔‘‘

’’یہ تو بہت خطرناک وارننگ ہے۔‘‘ بنّے خان نے کہا۔

’’جی جناب۔ میں نے اپنے دوست کو سمجھایا کہ دے دو طلاق۔ بیویاں تو مل جاتی ہیں لیکن اچھا دوست نہیں ملے گا۔‘‘

’’یعنی تم اس کا گھر برباد کرنے کی پلاننگ کر رہے ہو؟‘‘ بنے خان نے کہا۔

’’نہیں جناب۔ ایسی باتوں سے گھر کہاں برباد ہوتا ہے؟ وہ تو اپنی جگہ رہتا ہے۔ صرف بیوی چلی جاتی ہے۔‘‘

’’تمہارا علاج میرے پاس نہیں ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’سوری، میرے پاس تمہارے معیار کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔‘‘

’’دل نہ توڑیں جناب۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس ایک رشتہ ہے۔‘‘

وہ پھر سوچنے لگا۔ ’’ہاں ایک رشتہ ہے میرے پاس۔ اس کے پاس اپنا مکان ہے۔ تم جیسا ناکارہ انسان اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہ سکتا ہے۔‘‘

مجھے خود کو ناکارہ کہے جانے پر کوئی خاص افسوس نہیں

شہر کے پوش علاقے میں استادہ وہ کثیرالمنزلہ شاپنگ مال جدید طرزِ تعمیر کا حامل تھا۔ اس کے اندر ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ انسان کے روزمرہ کے استعمال کی ہر شے یہاں دستیاب تھی اور وہ بھی برانڈڈ۔ علاوہ ازیں فوڈ کورٹ اور منی سنیما گھر کی سہولت بھی اس مال میں میسر تھی۔ مال کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اس کے فورتھ فلور پر ڈاکٹرز نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہ سب ڈاکٹرز اپنے اپنے شعبے کے ماہر اور مہنگے کنسلٹنٹ تھے جو سہ پہر سے رات تک اپنے مخصوص چیمبرز

اپنی مجبوریوں کو بھرنے کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کرنے والوں کا قصہ۔۔۔۔۔

وقت نے ہر شے کو پَر لگا دیے ہیں۔۔۔ انداز نرالے اور اطوار منفرد اختیار کیے جارہے ہیں۔۔۔ ہمارے اردگرد پھیلے کرداروں نے اپنے چہروں پر ایسے نقاب چڑھا رکھے ہیں کہ اصل چہرہ کہیں دبیز تہوں میں کھو چکا ہے۔۔۔ منافق معاشرے سے جڑے ایک ماہر ڈاکٹر اور مریض کا ٹکرائو۔۔۔ ایک ہی ملاقات نے دونوں کو بے نقاب کردیا تھا۔۔۔

بجنگ آمد

حسام بٹ



میں بیٹھ کر وہاں آنے والے مریضوں کو ''دیکھا'' کرتے تھے۔ یہ تمام ڈاکٹرز کسی نہ کسی صاف ستھرے مہنگے پرائیویٹ اسپتال سے بھی وابستہ تھے۔ صاحبِ ثروت لوگ ہی ان کلینکس کا رخ کرتے تھے یا پھر وہ افراد جن کا مسئلہ ایسی پیچیدگی اختیار کر چکا ہو کہ انہیں کسی نامور مستند ڈاکٹر کی ماہرانہ رائے درکار ہو۔

اس کا مسئلہ بھی انتہائی پیچیدہ اور گمبھیر تھا۔ اسی لیے وہ اس مال کے فورتھ فلور پر ایک یورولوجسٹ کے کلینک میں پہنچا تھا۔ مذکورہ ڈاکٹر جملہ امراض بول کا ماہر مانا جاتا تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ذیابیطس اور امراضِ گردہ میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس شعبے میں شہر بھر میں اس سے زیادہ قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر کوئی اور نہیں تھا۔

وہ اپنے بیٹے کے حوالے سے مذکورہ یورولوجسٹ کے پاس آیا تھا۔ اس کے بیٹے کے گردے کا ایک سیریس ایشو اسے یہاں لے آیا تھا۔ اس نے کلینک میں قدم رکھا تو پہلا واسطہ ریسپشنسٹ سے پڑا۔ اسمارٹ اور طرح دار ریسپشنسٹ نے بڑی دل آویز مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے شیریں لہجے میں کہا۔

''یس سر! آپ کا نام کیا ہے؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا نام بتا دیا۔

ریسپشنسٹ نے کمپیوٹر کی اسکرین پر نگاہ دوڑا کر اس کا نام تلاش کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''سر! آج کے اپوائنٹ منٹس میں آپ کا نام شامل نہیں ہے......؟''

''اس کا ایک خاص سبب ہے۔'' وہ ریسپشنسٹ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اور وہ یہ کہ میں اپوائنٹ منٹ لیے بغیر ہی چلا آیا ہوں۔ میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں......!''

''سوری سر!'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب بغیر اپوائنٹ منٹ کے کسی کو نہیں دیکھتے۔ ان کے اٹھنے میں صرف ایک گھنٹا باقی ہے اور اس آخری گھنٹے کے دس اپوائنٹ منٹس میری کمپیوٹر فائل میں موجود ہیں۔ آپ کو اپوائنٹ منٹ لے کر آنا چاہیے تھا۔''

بات کے اختتام پر ریسپشنسٹ نے بڑی ادا سے کندھے اچکا دیے۔ اس نے ایک انگلی کی مدد سے اپنے گال پر کھجایا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

''میں نے کہا ہے نا، میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں!''

اس کے لہجے سے جھلکتی معنی خیزی نے ریسپشنسٹ کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے استعجابیہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سر! میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چرمی بیگ کو ریسپشنسٹ کی نگاہ کے سامنے کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ میں ایک دواساز کمپنی کا نمائندہ ہوں......میڈیکل ریپ!''

ریسپشنسٹ ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''تو یوں کہیں نا......!''

اسی لمحے ڈاکٹر والے مخصوص چیمبر میں سے دو خواتین برآمد ہوئیں جن میں سے ایک جوان اور دوسری ادھیڑ عمر تھی۔ جوان عورت کے ہاتھ میں دو بڑے بھورے اور تین چھوٹے سفید لفافے بھی تھے جن میں یقیناً ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ اور دیگر ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹس ہوں گی۔ اسی قسم کی چند رپورٹس اس کے چرمی بیگ میں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ رپورٹس اس کے بارہ سالہ بیٹے کی بیماری سے متعلق تھیں اور وہ انہی رپورٹس کے حوالے سے اس یورولوجسٹ سے ڈسکس کرنے آیا تھا۔

وہ دونوں خواتین آپس میں، دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے ریسپشن کے نزدیک سے گزرنے لگیں تو ریسپشنسٹ نے بڑے شائستہ انداز میں انہیں پکارا۔

''میم......!''

وہ دونوں رک گئیں۔ جوان عورت نے ریسپشنسٹ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یس!''

''میم! آپ فیس دینا بھول گئیں......!''

''کس چیز کی فیس؟'' اس عورت نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''ہم تو کل ڈاکٹر صاحب کو دکھانے آئے تھے اور میں نے فیس ادا کر دی تھی۔ آج تو صرف یہ رپورٹس دکھانا تھیں۔'' بات ختم کرتے ہی اس عورت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے براؤن اینڈ وہائٹ لفافوں کو ریسپشنسٹ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ریسپشنسٹ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''لیکن اصول یہی ہے کہ آپ جتنی بار بھی ڈاکٹر کے چیمبر میں جائیں گی، فیس ادا کرنا ہوگی۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ ڈاکٹر صاحب سے اس امر کی تصدیق کر سکتی ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''میم! میں تو ایک معمولی سی ملازم ہوں۔ آپ کے ساتھ کوئی ضد بحث نہیں کر سکتی۔ اگر آپ فیس دیے بغیر چلی جائیں گی تو مجھے ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سننا پڑے گی اور عین



تصویر کی چوری

عکسِ فاطمہ

زندگی کے روزمرہ اُمور نمٹاتے ہوئے کچھ تفریح کے لمحات بھی میسر ہونے چاہئیں... وہ بھی اپنے کاموں کی انجام دہی کے بعد تھک جاتا تھا... اتفاق سے اسے ایسی پارٹی میں شرکت کرنا تھی... جہاں اس کی پسند کا ساماں موجود تھا... مگر یہاں بھی اسے پارٹی کا مزہ کرکرا کرکے اپنی توانائی کام پر مرکوز کرنا پڑی...

ایک قیمتی تصویر کی چوری کا ڈرامائی معاملہ......

باہر لگی ہوئی تختی بتا رہی تھی کہ بیلویڈر کلب 1872ء میں قائم ہوا تھا اور میرے پاس اس کی تصدیق یا تردید کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ سرخ اینٹوں والی یہ عمارت جس کی پہلی منزل پر یہ کلب واقع ہے، 1864ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جولیس کے گھر سے یہاں تک کا فاصلہ اکیس فٹ اور چار اعشاریہ دو انچ ہے۔ میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کلب کی دیواروں پر لگی ہوئی لکڑی اس عمارت کی تعمیر کے دوران لگائی گئی تھی۔ مجھے

کلب میں رکھی کرسیوں کے ماڈل اور بنانے والے کا نام بھی معلوم تھا اور یہ کرسیاں 1932ء اور 1936ء کے درمیان کسی وقت خریدی گئی تھیں جب یہ ماڈل آنا بند ہوگیا تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ گزشتہ برسوں کے دوران ایک درجن یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ ان کرسیوں کی مرمت کروائی گئی تھی کیونکہ وہ سب بہت اچھی حالت میں تھیں جبکہ میں نے ان پر بڑے بھاری بھرکم لوگوں کو بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ کلب کی لائبریری میں 728 کتابیں تھیں۔ کلب کے اراکین کی تعداد 67 تھی جن سے جولیس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی جب میں اُس کے ساتھ ہوتا تھا اگر میری غیر موجودگی میں وہ ان کے علاوہ کسی سے ملتا تھا تو یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس کلب میں کوئی کمپیوٹر نہیں تھا جیسے وہ لوگ انیسویں صدی میں رہ رہے ہوں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں کچھ معلومات ہیک کرسکوں۔ یہ سب میں نے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر معلوم کیا تھا کیونکہ جولیس یہاں باقاعدگی سے آتا تھا اور اسے اپنا دوسرا گھر سمجھتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کلب کے اراکین سے سالانہ ممبرشپ کی فیس کے طور پر ایک بہت بڑی رقم وصول کی جاتی ہے۔ میں جولیس کے لیے دوسرے کاموں کے علاوہ پرائیویٹ اکاؤنٹنٹ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور اس فیس کے علاوہ اس کے تمام بلوں کی ادائیگی میرے ذمے تھی۔ جولیس ہر سال یہ فیس خود ادا کرتا تھا لیکن کیونکہ مجھے اس کے اکاؤنٹ کا ریکارڈ رکھنا ہوتا تھا اس لیے وہ مجھے اس رقم کے بارے میں بتا دیتا تھا۔ اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ یہ فیس اس کی معیشت پر کتنا بڑا بوجھ ہے اور کلب والے جو فرانسیسی شراب مہیا کرتے ہیں، وہ سستی نہیں پڑتی۔

جولیس کہا کرتا تھا کہ انگور کی شراب کا ذخیرہ کرنا یا للی کے ساتھ فوراسٹار ہوٹلوں میں اکثر و بیشتر ڈنر کرنا فضول خرچی نہیں بلکہ مہذب زندگی گزارنے کی ضرورت ہے اور کلب کی بھاری فیس کے حق میں بھی وہ یہی دلیل دیتا تھا۔ مجھے اس بارے میں کوئی شکایت نہیں۔ وہ فطرتاً کاہل تھا اور اپنے کام پر توجہ دینے کے بجائے سارا دن دفتر میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتا، اسے للی، شراب پینے، کتابیں پڑھنے اور جُوا کھیلنے سے ہی فرصت نہیں تھی لیکن اس طرزِ زندگی کے اخراجات بہت زیادہ تھے اور اس کلب کی فیس کی وجہ سے اس کے لیے لازم ہوگیا تھا کہ وہ سال میں ایک یا دو اضافی کیس کرے۔ اس طرح مجھے بھی اس کے کام کا مشاہدہ اور اپنے نیوٹرون نیٹ ورک کو بہتر بنانے کا موقع مل جاتا تھا۔

"تمہارے ڈنر کے لیے ریزرویشن ساڑھے سات بجے کی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"اور ڈراما ساڑھے نو بجے سے پہلے شروع نہیں ہوگا۔ اس لیے تم نہیں چاہو گے کہ آج سہ پہر میں تم نشے میں دھت ہو۔"

جولیس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ایک یا دو گلاس پینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم اس شراب کے بارے میں جو تصور قائم کیے ہوئے ہو اگر یہ اس کے مقابلے میں آدھی بھی اچھی ہوئی تو میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم دو گلاسوں پر اکتفا نہیں کرو گے۔"

"تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آرچی۔" جولیس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے مجھے کب نشے میں دھت دیکھا ہے؟"

"یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں پوکر کھیلنے کے دوران کافی مقدار میں وہسکی پیتے ہوئے دیکھا ہے لیکن تم پر اس کا کوئی ظاہری اثر نہیں ہوا۔ کم از کم میں نے کبھی تمہیں لڑکھڑاتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اگر تم نے آج زیادہ مقدار میں فرانسیسی شراب چڑھالی تو ڈراما دیکھنے کے دوران تمہیں نیند آجائے گی اور تم نہیں چاہو گے کہ للی کو تمہارے خراٹوں کا پتا چلے۔"

"میں خراٹے نہیں لیتا۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

کیونکہ رات کو جولیس مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے خراٹوں کی آواز ریکارڈ کررکھی تھی جو میں اسے سنا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسی صورت میں خطرہ تھا کہ وہ میرا سوئچ آف کردیتا اور میں رات بھر کے لیے عملاً ناکارہ ہوجاتا۔

جن لوگوں نے میرے پچھلے کیسز کے بارے میں نہیں پڑھا، وہ یقیناً میرے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ میرا نام آرچی اسمتھ ہے اور میں جولیس کا پرائیویٹ سیکریٹری، آل راؤنڈر اسسٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ ہوں اور جب اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ختم ہونے لگیں تو اسے خبردار کرنا بھی میری ذمے داری ہے گو کہ میں گوشت پوست کا انسان نہیں اور اس حوالے سے بہت حساس ہوں تاہم میرے ذہن میں اپنی جو تصویر ہے، اس کے مطابق میرا قد چھوٹا، گنجا اور عمر تیس کے قریب ہے۔ دراصل میں دو ضرب ایک انچ کا مستطیل نما ٹکڑا ہوں جو موجودہ دور کی کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے بیس سال آگے کا شاہکار ہے۔ مجھ میں نیوٹرون نیٹ ورک نصب ہے اور میں ایک Titaiom کے خول میں بند ہوں جسے جولیس ایک ٹائی پن کی طرح استعمال کرتا ہے۔ میرے اندر انتہائی حساس آڈیو وڈیو آلات نصب ہیں جو مجھے دیکھنے اور سننے میں

پانچویں قسط

الاؤ

کاشف زبیر

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اپنے قلم سے اسے اختتام تک پہنچا سکیں... اس دلچسپ اور پُرتجسس کہانی کو اسی انداز میں انجام تک لے جانا ایک امتحان تھا... آخرکار آپ کے جانے پہچانے اور مقبول و معروف مصنف کو یہ کام سونپا گیا جو کاشف زبیر کی لکھی ہوئی اقساط کے بعد قارئین کے لیے اپنے ہنر کے جوہر دکھائیں گے... **الاؤ** ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور ایسی داستان ہے جو قارئین کو اول تا آخر اپنی گرفت میں رکھے گی...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں



ہم ساکت رہ گئے تھے۔ حمیرا کانپ رہی تھی اور مجھ سے چپک گئی۔ خود میری حالت اچھی نہیں تھی لیکن طارق نے سکون سے پوچھا۔ ''اگر ہم ایسا نہ کریں تو تم کیا کرو گے؟''

''میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔''

''کردو۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اگر ہم نے ہتھیار ڈال دیے تو تم بعد میں بھی سکون سے اور تڑپا تڑپا کر مارو گے۔ اس سے بہتر ہے کہ یہیں قتل کردو، ویسے پولیس آنے والی ہوگی اور تمہاری جان بخشی بھی اتنی آسانی سے نہیں ہوگی۔'' طارق نے ڈرانے کی کوشش کی۔

''بکومت۔'' تاج غرایا۔ ''میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہتھیار پھینک دو۔''

تاج کی پہلی وارننگ سے طارق نے اس کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ اسے ہمیں شوٹ کرنا ہوتا تو ہمیں خبردار ہی نہ کرتا گاڑی سے اترتے ہی شوٹ کردیتا۔ اس کے پاس خودکار رائفل تھی، ایک ہی برسٹ سب کے لیے کافی ہوتا۔ مگر وہ ہمیں اپنے قبضے میں چاہتا تھا اس لیے ہتھیار پھینکنے پر زور دے رہا تھا۔ بیرونی فائرنگ ہوئے بھی کئی منٹ گزر چکے تھے اور اب تک مقامی گارڈز بھی نظر نہیں آئے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ خودکار ہتھیاروں کی فائرنگ کی آواز دور دور تک نہ گئی ہو لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ مقامی گارڈز نے بھی فی الحال اس طرف نہ آنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اس بار بھی ہم ساکت رہے تو تاج نے فیصلہ کن انداز میں رائفل بلند کی۔ طارق نے جلدی سے کہا۔ ''اوکے...... لیکن کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں شوٹ نہیں کرو گے؟''

''کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' تاج بولا۔ ''میں تین تک گنوں گا۔''

''ضرور گنو۔'' طارق پھر غیر سنجیدہ ہوگیا۔ ''اس سے یہ تو پتا چل جائے گا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔''

''خدا کے لیے۔'' حمیرا کانپتے لہجے میں بولی۔ ''یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''اس نے کم سے کم دو مواقع پر ہماری جان لینے کی کوشش کی۔''

''میرے ہی ہاتھوں مارے جاؤ گے۔'' تاج نے دانت نکالے اور گننا شروع کردیا۔ ''ایک...... دو...... تین۔''

اس کے تین کہتے ہی فائر ہوا۔ ہم تینوں بے ساختہ جھکے تھے مگر فائر رائفل کا نہیں بلکہ پستول کا تھا۔ تاج کراہا اور اچانک بونٹ کے دوسری طرف غائب ہوگیا۔ طارق نے خوش ہوکر کہا۔ ''یہ کام کیا تا اس نے اب بھاگو۔''

ہم تینوں بیک وقت بھاگ اٹھے۔ ہمارا رخ اب کار کی طرف تھا۔ اسی لمحے سڑک کے دوسری طرف سے سرفراز نمودار ہوا اور بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ دراصل طارق نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ وقت ضائع کر رہا تھا کہ سرفراز پیچھے آکر تاج پر وار کرسکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اسے دیکھ کر ہماری رفتار ذرا کم ہوگئی تھی۔ اس نے قریب آکر ہانپتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو؟''

''فائر تم نے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور حمیرا کی طرف دیکھ کر دانت نکالے۔ ''شکر ہے جی آپ مل گئیں، میری رقم بھی مل جائے گی۔''

''تمہیں رقم کی فکر ہے۔'' حمیرا نے خفگی سے کہا۔

''آپ کی بھی تھی جی۔'' سرفراز زیادہ ہی خوش تھا۔

''میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔'' طارق خفگی سے بولا۔ ''فائر کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''اس سے پہلے جی کسی بندے پر گولی نہیں چلائی۔'' سرفراز نے وضاحت پیش کی۔ ہم رک کر باقاعدہ خوش گپیوں میں لگ گئے تھے اور چند لمحے کے لیے تاج کو بالکل ہی بھول گئے۔ گولی لگنے پر وہ جس طرح غائب ہوا تھا، اس سے ہمیں لگا کہ شاید وہ مارا گیا ہے یا ناکارہ ہوگیا ہے۔ اس لیے جب وہ اچانک جیپ کے دوسری طرف سے نمودار ہوا تو ہم بھڑک کر بھاگے۔ اس نے عقب سے اندھا دھند برسٹ چلایا جو ہوا میں گیا پھر چیخ کر ایک گندی گالی دی۔ طارق نے ایک لمحے کو رک کر جوابی برسٹ مارا تو وہ دوبارہ جیپ کے پیچھے غائب ہوگیا۔ طارق کی رائفل کا شور نہیں تھا مگر تاج نے شعلے نکلتے یقیناً دیکھ لیے تھے۔ گالی دیتے ہوئے اس کے لہجے میں اذیت تھی مگر وہ پوری طرح ہوش میں تھا اس کا مطلب تھا کہ گولی نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ہم آدھے منٹ میں کوئی دو سو گز آگے نکل آئے تھے۔ سب ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ مگر ہم اب بھی خودکار رائفل کی حد میں تھے۔ میں حمیرا کو بھی کھینچ رہا تھا۔ کوئی تین سو گز دور نکلنے کے بعد ہماری رفتار ذرا سست ہوئی تھی اور حمیرا نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اب مجھ سے نہیں بھاگا جا رہا۔'' وہ ننگے پاؤں تھی اور پھر بھوکی پیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ زخمی بھی تھی۔

''رکومت ابھی ہم خطرے میں ہیں گاڑی بس کچھ دور ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔



اندھا قانون

مظہر سلیم ہاشمی

بعض واقعات... سانحات بڑے عجیب ہوتے ہیں... سب کچھ عیاں ہونے کے باوجود حقیقی واقعے کو دل و دماغ تسلیم نہیں کر پاتے... اور اپنے من کو جھوٹی تسلیوں کی تھپکیوں سے شاد رکھنے کی کوشش جاری رکھتے ہیں... ایک ایسی ہی پُراعتماد... حساس لڑکی کا ماجرا... ماں اس سے کوسوں دور تھی لیکن وہ اپنی ماں کے لیے خوب صورت پوسٹ کارڈ اور تحائف خریدنا نہیں بھولتی تھی... وقت نے اسے انتقام کے بجائے قانون کا رکھوالا بنا دیا...

محدود ہو جانے والا انصاف اور لامحدود ناانصافی کا سنسنی خیز احوال...

وہ چھوٹا سا ائرپورٹ خلاف توقع کافی مصروف تھا۔ گرمی بھی اس کی برداشت سے زیادہ تھی اور مارلینا کو اپنے ساتھی کا ہم قدم رہنے کے لیے معمول سے زیادہ رفتار کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔

''ٹرانسمیٹر بہت ہی چھوٹا سا ہے...... کسی قلم تراش سے بھی آدھا......'' اسپیشل ایجنٹ اوون لی نے کہا۔ اس کا جسم کسی تیراک کے مانند دبلا پتلا سا تھا اور بولتے ہوئے زبان میں ہلکی سی تتلاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ ''تمہارا کام بس،

ہوشیاری سے ٹرانسمیٹر نصب کرنا ہے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو کہ جو مرضی آئے کرو۔ ویسے بھی 'کے مین آئی لینڈ' پہ حکومت کے خرچے پر عیاشی کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔''

''میں ابھی بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرا ہی خصوصی طور پر انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟'' مارلینا نے کہا۔

یہ واقعی ایک جواب طلب سوال تھا۔ مارلینا لیب میں کام کرتی تھی۔ وہ فرانزک کے کام میں ماہر تھی جبکہ یہ کام کسی جاسوس کے کرنے کا تھا۔

''مجھے ایک پُراعتماد جوان لڑکی کی تلاش تھی ...... جو ہدایات پر اچھی طرح عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا دماغ استعمال کرنے کے قابل بھی ہو۔'' لی نے خشک لہجے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکی کا غیر معمولی طور پر حسین ہونے کے ساتھ ساتھ کیوبن نژاد ہونا بھی ضروری تھا...... کیونکہ ہمارے مطلوبہ شخص کی یہی کمزوری ہے۔ اب ایسے میں تمہارا نام ہی سامنے آتا تھا۔''

''ہمارا مطلوب کون ہے؟''

''میلکم فلیچر......''

چلتے چلتے مارلینا کی ٹانگیں ایک مرتبہ کانپ کر رہ گئیں اور اس نے خود کو بمشکل لڑکھڑانے سے بچایا۔

میلکم فلیچر ایف بی آئی کے بہترین دماغوں میں سے ایک تھا اور اب وہ اپنی ہی تنظیم کا مخالف ہو چکا تھا۔ تقریباً تین فیڈرل ایجنٹوں کی موت کا ذمے دار ٹھہرانے کے بعد اس کے سر کی قیمت دو ملین ڈالر مقرر کی گئی تھی۔

یہ صرف وہ قیمت تھی جو کہ حکومت کی مقرر کردہ تھی۔ کئی سال سے مارلینا یہ افواہیں بھی سن رہی تھی کہ جان پال روسو نے اس کے سر کی قیمت پانچ ملین ڈالر رکھ دی تھی۔ اسپیشل ایجنٹ اسٹیفن روسو اس کا بیٹا تھا جو فلیچر کو پکڑنے کی مہم میں ناکام رہا تھا۔ یہ ناکامی اُسے بستر پر پہنچا چکی تھی اور وہ محض نالیوں کی مدد سے خوراک حاصل کر کے زندہ تھا...... دماغ کب کا مردہ ہو چکا تھا۔

''تمہارے تاثرات سے تو لگتا ہے کہ تم میلکم فلیچر سے بخوبی واقف ہو......؟''

مارلینا نے سر کو اثبات میں ہلا کر اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''اسے ایف بی آئی میں کون نہیں جانتا ہوگا۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔'' لی نے اس کی تائید کی۔

''کیا اُس کی آنکھوں کے بارے میں سچ کہا جاتا ہے؟'' مارلینا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں سچ سنا ہے تم نے...... بالکل گھور سیاہ آنکھیں ہیں اُس کی......'' لی نے جواب دیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم نے لیب سے ہٹ کر فیلڈ اسسٹنٹ کی جاب کے لیے درخواست دی ہے؟''

''جی بالکل صحیح سنا ہے......'' مارلینا نے جواب دیا۔

اس جاب کے لیے اپلائی کرتے ہوئے اسے پوری امید تھی کہ لیب میں فرانزک کے کام کا تجربہ مددگار ثابت ہو گا اور دیگر درخواست دہندگان کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جائے گی۔ اس کا خواب تھا کہ وہ تفتیشی یونٹ میں جائے جہاں سیریل کلرز سے نمٹا جاتا تھا۔

''فلیچر کو پکڑنے اور انصاف کے کٹہرے تک پہنچانے میں مدد فراہم کرنا ایک ایسا بڑا کام ہو سکتا ہے جو تمہارا کیریئر بنا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم دی گئی ہدایات پر اچھی طرح عمل کرو گی۔'' لی نے دوٹوک انداز میں اس کی ترقی کو اس کام سے مشروط کرتے ہوئے کہا۔

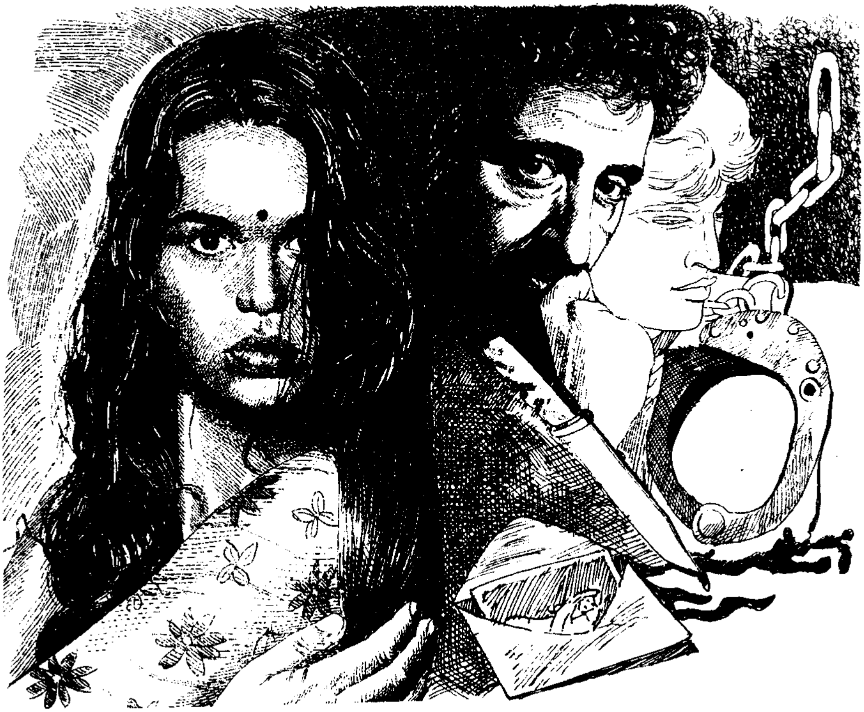
''آپ مجھ پر مکمل بھروسا کر سکتے ہیں سر......'' مارلینا نے غیر شعوری طور پر اٹینشن ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے...... اب تمہارے لیے ایک بہترین لباس تلاش کرنا ہے کیونکہ تم ایک کاک ٹیل پارٹی میں جا رہی ہو۔''

ائرپورٹ سے باہر نکل کر مارلینا نے اپنا مختصر سوٹ کیس اوون لی کے کہنے پر ایک جیپ کے عقبی حصے میں رکھ دیا۔ گاڑی کا ڈرائیور کسی دیو جیسا ڈیل ڈول رکھتا تھا۔ اگر وہ ایجنٹ نہ ہوتا تو فلموں میں ہلک (HULK) کا کردار بخوبی نبھا سکتا تھا۔ اس کے سر پر ایک پی کیپ تھی جو نیویارک کی بیس بال ٹیم سے وابستگی کا اظہار تھی۔ جسم پر منڈھی ٹی شرٹ اتنی کسی ہوئی تھی کہ لگتا تھا ابھی پھٹ جائے گی۔ وہ لی کی اسپیشل ٹیم کا رکن ہیری جیکب تھا۔

لی کے مطابق میلکم فلیچر نہایت مخصوص قسم کا ذوق رکھتا تھا۔ اسے گھیرنے کے لیے ہر چیز کا پرفیکٹ ہونا لازمی تھا۔ بوتیک پر پہنچ کر اس نے اصرار کیا کہ مارلینا مختلف لباس پہن کر اس کے سامنے ماڈلنگ کرے تاکہ انتخاب میں آسانی ہو۔

جب بھی وہ نیا لباس پہن کر سامنے آتی تو چرمی صوفے پر براجمان لی اسے مختلف زاویوں سے گھوم کر دکھانے کو کہتا۔ وہ نہ مسکرا رہا تھا اور نہ ہی زیادہ الفاظ کا استعمال کر رہا تھا لیکن مارلینا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جسم کے کھلے حصوں پر اُس کی نگاہیں کسی برچھے کی مانند چھید کر



آخری کیس

اعتزاز سلیم وصلی

انسان کا خمیر جذبات و احساسات سے گندھا ہے... اور کبھی کبھی وہ جذباتی ہو کے وہ قدم اٹھا لیتا ہے... جسے اٹھانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہو... ایسی ہی جذباتی لغزشیں بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں... ایسے ہی لمحوں میں سرزد ہو جانے والی غلطیوں کا خوں ریز احوال...

سراغری کا پیشہ چھوڑ دینے والے سراغرساں کا آخری کیس...

صبح صبح اٹھ کر سب سے پہلے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھنا کسی بھی شخص کو اچھا نہیں لگتا اور جس عمر سے میں گزر رہا تھا، اس عمر میں تو ڈاکٹر ویسے بھی موت کے فرشتے کی طرح لگتے ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ ڈاکٹر معدہ، دل، جگر یا پھیپھڑوں کے بجائے شہر کا میرا پسندیدہ ڈینٹسٹ تھا۔ ''ہیلو ڈاکٹر وجیش چوہدری۔'' فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی میں نے ہاتھ ہلا دیا۔

''ہائے انسپکٹر کبیر۔'' اس وقت میری بیٹی یہاں موجود ہوتی تو انسپکٹر کہلائے جانے پر ضرور اعتراض کرتی مگر

وہ کالج جا چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر وجیش کو اندر بلایا اور اس چھوٹے سے کمرے میں بٹھا کر جسے میری بیٹی نورین ڈرائنگ روم کہتی تھی، خود کچن میں گھس گیا۔ میں واپس آیا تو ڈاکٹر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیا۔ میں نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھا۔ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کافی کا کپ اٹھا لیا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش میری نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔

''کیا بات ہے وجیش، کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ کا علم تو تمہیں ہوگا۔''

''ہاں کچھ کچھ...... مگر میں تفصیل جاننا چاہوں گا۔''

''پولیس نے مجھ پر الزام لگا دیا ہے کبیر...... میں اپنی بیٹی کو کیسے قتل کر سکتا ہوں، اکلوتی اولاد تھی وہ میری۔'' اس نے دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میں نے اپنا کافی کا کپ میز پر رکھا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ لگے تھے اسے سنبھلنے میں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے دوبارہ کہا۔

''مجھے تفصیل بتاؤ، شروع سے لے کر اب تک......''

''پولیس نے تین ماہ میں اپنی تفتیش مکمل کی ہے...... دو لاشیں ملنے کے بعد اب وہ مجھے قاتل کہہ رہے ہیں، روپا کو بھی اس سارے معاملے میں ملوث کیا جا رہا ہے......''

''لیکن یہ ہوا کیسے؟ پولیس کی اپنی تفتیش پر میڈیا نے سوال اٹھائے ہیں۔''

''ہاں، وہ جلد سے جلد خونی تک پہنچ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔''

''مجھے پوری کہانی سنی ہے وجیش۔''

''سناتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی اور نظریں چھت پر جما کر بولنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

اس دن میں اور روپا نے اروشی کے لیے نیا لیپ ٹاپ خریدا تھا۔ اس کی سالگرہ دو دن بعد تھی۔ روپا بھی ڈاکٹر ہے اس لیے ہم دونوں کو اس کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اس کی سالگرہ والے دن مجھے ایمرجنسی ڈیوٹی کا خوف تھا اس لیے میں نے روپا کی اجازت سے لیپ ٹاپ دو دن پہلے اسے گفٹ کر دیا۔ اروشی بہت خوش تھی۔ وہ صرف تیرہ سال کی تھی اور خوبصورت روپ تھا اس کا۔ مجھے اور روپا کو اس میں اپنی زندگی محسوس ہوتی تھی۔ گفٹ لینے کے بعد اس نے ہمیں لیپ ٹاپ پر گانے چلا کر دکھائے اور کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تب رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہم سب نے ڈنر ایک ساتھ رات نو بجے کیا اور اس کے بعد دوبارہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہمارا ملازم بلراج چھٹی کر کے جا چکا تھا۔ کھانا روپا نے تیار کیا تھا۔ رات گیارہ بجے تک گھر میں لگا انٹرنیٹ کنکشن آن تھا اور میں ضروری کام کرتا رہا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ روپا مجھ سے پہلے سو چکی تھی۔ دوسری صبح جب روپا اٹھی تو ساتھ والے گھر کی ملازمہ ہمارے گھر سے کچھ لینے آئی تھی لیکن دروازہ لاک تھا۔ ہمارے داخلی دروازے دو ہیں۔ رات کو اکثر دونوں لاک ہوتے ہیں۔ ایک چابی ہمارے پاس ہوتی ہے اور ایک بلراج کے پاس۔ روپا کو حیرت ہوئی کیونکہ بلراج صبح صبح آ کر ہمارے جاگنے سے پہلے کام مکمل کر چکا ہوتا تھا۔ اس نے بالکونی میں جا کر نیچے کھڑی ملازمہ سے پوچھا۔

''تم نے بلراج کو دیکھا ہے؟''

''نہیں مالکن۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے میں دروازہ کھولتی ہوں۔'' روپا نے چابی ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر صرف اندرونی دروازے کی چابی ملی۔ بیرونی دروازے کی وہ چابی جو ہمارے پاس تھی، غائب تھی۔ روپا نے پورا گھر چھان مارا مگر وہ چابی نہ ملی۔ اس کے بعد اس نے ماسٹر کی تلاش کی جو ایسی ہی صورت حال میں استعمال کرنے کے لیے رکھی تھی۔ اس سے دروازہ کھول کر اس نے ملازمہ کو اندر بلایا۔ اس دوران میری آنکھ کھل گئی۔ ملازمہ چلی گئی تو ہم نے بلراج سے رابطہ کرنے کا سوچا مگر اس کے پاس سیل فون نہیں تھا۔ اس لیے ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ روپا نے کچن میں جا کر ناشتا بنایا۔ یہی وقت تھا جب ہمیں خیال آیا کہ اروشی ابھی تک نہیں اٹھی۔ وہ جلدی اٹھنے کی عادی تھی۔

''ذرا اسے جا کر اٹھاؤ۔'' میں نے روپا سے کہا۔ روپا، اروشی کے کمرے میں چلی گئی جو کے توقع کے برعکس کھلا ہوا تھا۔ روپا کے کمرے میں داخل ہونے کے دو منٹ بعد مجھے اس کی چیخیں سنائی دیں۔ میں بھاگ کر گیا۔ میں نے دیکھا...... اروشی کے اوپر جو کمبل تھا وہ خون سے سرخ تھا۔ اس کو مرے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کسی نے چاقو کے وار سے اس کی گردن ادھیڑ دی تھی۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں بس چیخ رہا تھا۔ نجانے کب پڑوسیوں کو اطلاع ملی اور وہ بھاگ کر آئے۔ اس کے بعد پولیس کو اطلاع دی گئی۔

پولیس نے مکمل تفتیش کے بعد جو پہلا نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ

نیک نامی

احمد سلیم سلیمی

انسان کے اعمال ہی اس کی پہچان کا باعث بنتے ہیں... اگر ایک دفعہ غلط قدم اٹھ جائے تو پھر دوسرے قدموں کو برائی کے راستے جکڑ لیتے ہیں... ایسے ہی نوجوان کی کتھا... جو ناسمجھی میں غلط راہ پر چل پڑا تھا... اپنی محبت کی خاطر وہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ اپنے نام سے جڑی بدنامی کی شناخت کو مٹا ڈالے گا...



بدنامی سے نیک نامی کا سفر...... ایک راہِ پُرخطر کا ذکر......

وہ مرکزی چوک سے گھوم کر بڑی سڑک پر آیا۔ پھر تیز تیز چلتا اس کھلے میدان کی طرف جانے لگا جہاں ایک سیاسی جلسہ پورے آب و تاب سے جاری تھا۔ دھوپ کے روپ چاروں اور بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑوں سے اُتر کر بدن میں جذب ہو رہے تھے۔ ان کی تپش سے جسم سلگ رہا تھا۔ ہوا بھی گرم تھی، فضا بھی گرم۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا اُس کے کانوں میں شور بڑھ رہا تھا۔ اسے علم تھا مرکزی چوک سے کچھ فاصلے پر

ایک کھلے میدان میں ایک سیاسی جماعت کا جلسہ ہو رہا تھا۔ وہ ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ جب اس کی فنکاری اور مہارت کے جوہر کھل جاتے تھے۔ اور اس کی دو انگلیاں جذبات و جوش میں بے خود لوگوں کی جیبوں کی صفائی میں لگ جاتی تھیں۔

اس کا نام رمضان علی تھا۔ لیکن وہ ''رمضو'' کی عرفیت سے مشہور تھا۔ پولیس کے ریکارڈ میں ''رمضو جیب کترے'' کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ صرف جیب کترا نہیں تھا، چوری چکاری کا بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا تھا۔ کبھی پوری سزا ہوتی تھی۔ کبھی پولیس والوں کے چھتر سے توبہ تائب ہو کر اور کبھی مک مکا کر کے سلاخوں سے باہر آتا۔ پھر چند دن بعد وہی پرانی ڈگر ہوتی اور اس کے کالے کرتوت ہوتے تھے۔

رمضو جلسہ گاہ کے پاس آیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ کرسیوں پر بھی، آس پاس کھڑے بھی۔ ایک لیڈر ٹائپ کا شخص بلند اسٹیج پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ اس کی تقریر بڑی ہی جوشیلی تھی۔ وہی روایتی جوش، جس میں حلق پھاڑ مائک توڑ انداز ہوتا ہے۔ ہمیشہ سے فریب خوردہ عوام اسی انہماک اور تپاک سے سنتے ہیں۔ زندہ باد، مردہ باد کے نعروں میں اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی جوش اور جذبے کے ساتھ اپنا مستقبل بھی برباد کر دیتے ہیں۔

اس وقت بھی لوگ بڑی توجہ اور شوق سے اس سیاسی رہنما کی باتیں سُن رہے تھے۔ وہ سیاسی رہنما اپوزیشن کی ایک قوم پرست پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ گونجتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''ہر اندھیری رات کے بعد سحر طلوع ہوتی ہے۔ مگر ہم کیسی بدنصیب قوم ہیں بہتر سالوں سے یہ اندھیرے ختم نہیں ہو رہے ہے۔ نظام بدل بدل کر، چہرے بدل بدل کر بے بصیرت سیاست کار ہم پر مسلط ہو رہے ہیں۔ اپنے چیلے چانٹوں، جیالوں اور طفیلیوں کو ہی سب کچھ نوازتے ہیں۔ پوری قوم مہنگائی، بے روزگاری اور بدعنوانی کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ اب ہمیں بدلنا ہوگا۔ روشنیوں کے ان لٹیروں سے لڑنا ہوگا۔ ایک اچھے مستقبل کی صبح پیدا کرنی ہوگی۔''

اس کی شعلہ بیانی نے اپنے آہنگ اور الفاظ سے گویا ایک سحر طاری کر دیا تھا۔ رمضو بھی لوگوں کے ہجوم میں موجود تھا۔ سب لوگ سانس روکے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

جلسہ گاہ پر ایک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ محض اس سیاسی رہنما کی گرج دار آواز گونج رہی تھی۔ مگر یہ سکوت اور یہ خاموشی رمضو کے حق میں نہیں تھی۔ وہ تو ہلچل چاہتا تھا۔ افراتفری اور اضطراب کا خواہاں تھا کہ اس کا کام آسانی سے ہو سکے۔ یکلخت وہ اٹھا اور پوری قوت سے سیاسی رہنما کا نام لے کر زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ اس کا یوں نعرہ لگانا تھا کہ گویا پُر سکون سمندر میں طغیانی آ گئی۔ سب لوگ گویا نیند سے جاگے۔ سب اس کے نعرے میں شامل ہو گئے۔ پھر اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ پھر وہ اپنا کام کرنے لگا۔ اس کی مشاق انگلیاں اپنے شکار کی جیبیں خالی کرنے لگیں۔ عوام کو اپنا ہوش کہاں تھا۔ ان کا لیڈر انہیں گرما رہا تھا۔ انہیں آگے کا راستہ دکھا رہا تھا اور رمضو اپنا ہنر دکھا رہا تھا۔ بہت سی جیبوں کا مال اپنی جیب میں منتقل کرنے کے بعد وہ جلسہ گاہ سے باہر نکلا۔ اس وقت تک وہ لیڈر بھی اپنی تقریر ختم کر چکا تھا۔ اور لوگ بے ہنگم انداز میں اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تھے۔ اس طرح رمضو کا کام مزید آسان کر رہے تھے۔

رمضو جلسہ گاہ سے باہر نکل کر یوں ہی ایک طرف چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ چند قدم چلا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس کے قدم جہاں تھے وہی تھم گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لی۔ وہ اس کا دوست شرافت تھا۔

''ابے اُلو کی دُم! کہیں بڑا ہاتھ مار کر تو نہیں آ رہا... ہو۔ کچھ ہوش ہی نہیں۔'' شرافت ہنستے ہوئے بولا۔ ''جلسہ گاہ میں تجھے دیکھا تھا۔ پھر میں نے تیرے ارادے کو بھی بھانپ لیا تھا۔ جلسے کے بعد میں بھی تیرے پیچھے چل پڑا۔ بازار میں آواز دی تھی مگر تو نے توجہ ہی نہ دی۔ میں نے بھی ٹھان لی کہ پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''یار ذرا آہستہ بولو۔ جانتے نہیں ہو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

شرافت نے قہقہہ لگایا۔ ''ابے رمضو کے بچے! ڈرتا کیوں ہے۔ سنا نہیں جلسے میں لیڈر صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ ڈرتے ہوئے جینا موت سے بدتر ہے۔ نکال کتنا مال کمایا ہے۔''

''دیکھ شرافت! تُو میرا یار ہے مگر اس مال سے تجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملے گی۔ یہ میری محنت کی کمائی ہے۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو تیار رہنا۔ رات ایک جگہ چلتے ہیں۔ چائنا مارکیٹ کے ایک بڑے بیوپاری کا مال آیا ہے۔

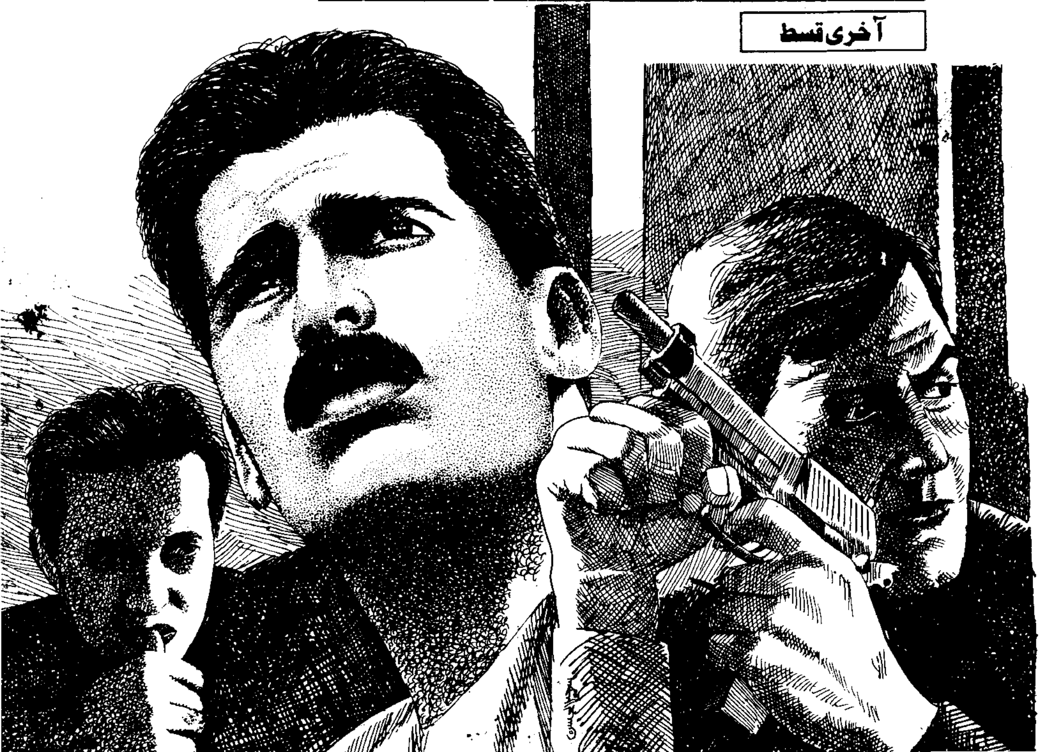
آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

آخری قسط



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتکسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتکسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا،

دعا کے کئی رنگ ہوتے ہیں دھاگوں کے مانند... کسی دھاگے پر خالق کی محبت کا رنگ چڑھا ہوتا ہے... اور کئی دھاگے انسان کی اپنی خواہشات اور تمناؤں میں رنگے ہوتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی زندگی کے مختلف روپ... اس نے نہ صرف کامیابی حاصل کرنے کا نسخہ پالیا تھا... بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھا... اپنے پرائے کی دلجوئی کر کے ان کے دکھوں کو سمیٹنے کا فن اسے بخوبی آتا تھا... اس کی یہی خوبی اس کی کامیابی کی ضمانت تھی...

ایک ایڈونچر پرست ناول نگار کو پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات......

انعام

امجد جعفری



اس سے پہلے کہ میں اپنی سرگزشت بیان کروں میں اپنا تفصیلی تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔اس وقت میری عمر چھتیس سال کے قریب ہے۔ قد چھ فٹ دو انچ۔ رنگ سرخی مائل گورا۔ مضبوط جسم۔ جنسِ نازک میں کافی مقبول ہوں۔ آبائی تعلق جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے ہے۔ پیدائش کے وقت میرا نام جوزف مین ہوف رکھا گیا تھا جو بعد میں صرف جوزف تک محدود ہو گیا۔

جب میں دس سال کا تھا تو میرے والدین نے

نقلِ مکانی کی اور جرمنی کو خیر باد کہہ کر کینیڈا کے شہر مانٹریال میں آکر بس گئے۔ یہ شہر کیوبک صوبے میں ہے یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ اب ہماری پوری فیملی تین تین زبانوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ یعنی جرمن۔ انگلش اور فرنچ۔ میرا زیادہ رجحان انگلش کی طرف ہے۔

میرے ڈیڈی کوالیفائڈ لائسنس ہولڈر ائرکرافٹ گراؤنڈ انجینئر تھے۔ مانٹریال میں انہیں ایک ائرلائن میں گراؤنڈ انجینئر کی جاب مل گئی۔ اچھی تنخواہ، اچھی رہائش اور نہایت شاندار لگژری کار۔ پوری فیملی بہت خوش تھی۔ دو سال کے بعد کینیڈا کی نیشنلٹی بھی مل گئی۔

میرے ڈیڈی نے جرمنی میں زیرِ تعلیم ایک نہایت خوب صورت ایشیائی لڑکی سے محبت کی شادی کی تھی۔ لڑکی کا تعلق ایشیا کے ایک سنگلاخ پہاڑوں سے گھرے ملک سے تھا جو دس پندرہ سال سے شدید خانہ جنگی کا شکار تھا۔ انٹرنیشنل اورگنائزیشن آف مائی گرینٹ نے اس ملک کے بہت سے خاندانوں کو نکال کر جرمنی میں بسایا تھا، ان میں اس لڑکی یعنی میری ماما کا خاندان بھی تھا۔

میری ماما م ہفتے میں ایک دن ضرور اسپائسی کھانے بناتی تھیں۔ یہ چٹ پٹے کھانے مجھے بہت پسند تھے۔ ڈیڈی کہتے تھے کہ اسپائسی کھانے بہت لذیذ ہوتے ہیں مگر یہ معدے کو خراب کر دیتے ہیں اس لیے کم کھانے چاہئیں۔

مانٹریال میں کئی اچھے ایشیائی ریسٹورنٹ تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ ہم اسپائسی کھانا کھانے کے لیے ان ریسٹورنٹ میں ضرور جاتے تھے۔ خاص طور پر ایک افغانی ریسٹورنٹ۔ بامیان ریسٹورنٹ کے چٹ پٹے کھانے مجھے اور میری ماما کو بہت پسند تھے۔

مانٹریال میں زیادہ تر فرانسیسی زبان بولی جاتی تھی مگر میرا رجحان زیادہ انگلش زبان کی طرف تھا۔

گریجویشن کے بعد میں نے انگلش میں مضامین لکھنے شروع کر دیے جو کینیڈا اور امریکا کے اخباروں اور میگزینز میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا اچھا معاوضہ بھی ملتا تھا۔ ماما اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ مجھے اب ناول نگاری شروع کر دینی چاہیے۔

پچیس سال کی عمر میں، میں نے پہلا ناول لکھا اور اس کا مسودہ لے کر ایک پبلشنگ ایجنٹ کے پاس پہنچ گیا۔ ایجنٹ کا نام لارا تھا عمر کوئی بائیس تیئس سال، نہایت خوب صورت، صحت مند اور کالی کالی بڑی آنکھوں والی نہایت ذہین، اس کے مشورے پر میں نے ناول کا مسودہ اس کے پاس چھوڑ دیا اور ایک ہفتے کے بعد پھر اس کے آفس پہنچ گیا۔

لارا نے کہا۔ ''مسٹر جوزف، پبلشر نے تمہارا ناول منظور کر لیا ہے۔ معاوضہ پچیس ہزار ڈالرز۔ اگر تمہیں قبول ہو تو معاہدے پر سائن کرو اور پچیس ہزار ڈالرز کا چیک لے لو، میرا کمیشن دس فیصد ہوگا۔''

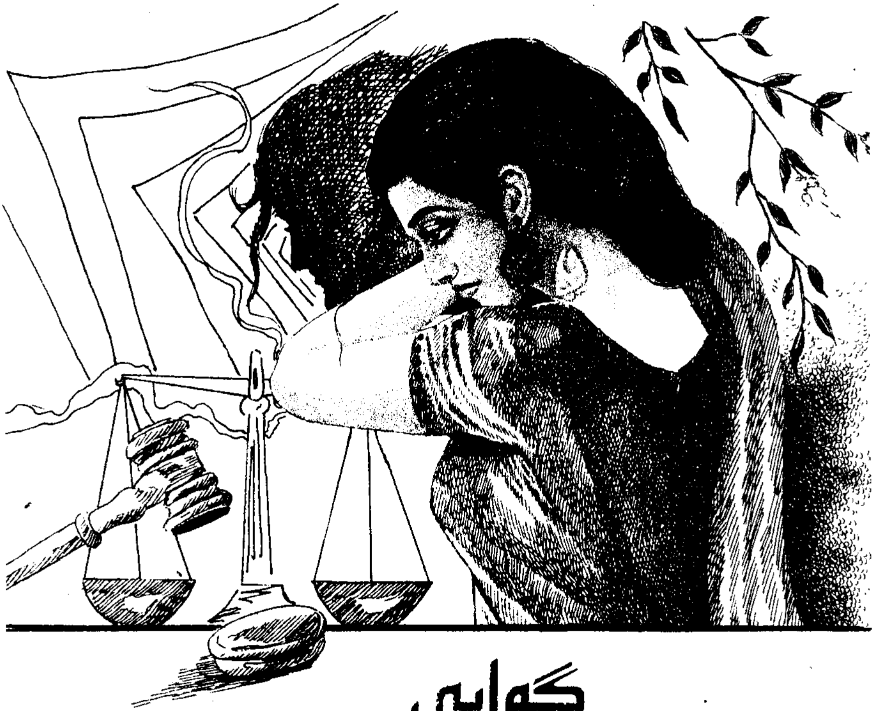
میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا پہلا ناول پہلی ہی کوشش میں منظور ہو گیا تھا۔ میں نے معاہدے پر سائن کر کے پچیس ہزار ڈالرز کا چیک وصول کر لیا۔ لارا کے کمیشن کے ڈھائی ہزار ڈالرز کا چیک اس کے حوالے کیا اور خوشی خوشی گھر آگیا۔ سب سے پہلے وہ چیک میں نے اپنی ماما کے ہاتھ پر رکھا۔ میرے ڈیڈی اب دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ دو انڈر ٹریننگ انجینئرز کے ساتھ ایک چھوٹے جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ جہاز کریش ہو گیا۔ ڈیڈی سمیت سب کی ڈیتھ ہو گئی۔ ماما کو انشورنس اور کمپنی کی طرف سے کافی پیسے ملے تھے جس سے ہماری گزر بسر بہت اچھی طرح ہو رہی تھی۔

میرا ناول شائع ہو گیا تھا۔ ایک ماہ کے بعد میں نے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اپنی ایجنٹ لارا کو فون کیا۔ اس نے کہا۔ ''جوزف ناول کی مارکیٹ رپورٹ بہت اچھی ہے مگر تنقید نگاروں کی رائے کچھ اچھی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس ناول میں صرف سیکس ہے اور کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرا ہورڈ رابن پیدا ہو گیا ہے جوزف اس کی طرف دھیان دو۔ سیکس کا لیول کچھ کم کرو۔''

''لارا، میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا۔ دوسرے ناول کے ڈیڑھ سو پیج لکھ چکا ہوں۔ اس میں سیکس بس اتنا ہے جتنا سڈنی شیلڈن کے ناولوں میں ہوتا ہے۔''

''جوزف اس سے بھی کم کرو۔ سڈنی شیلڈن کے ہر ناول کے دو تین پیج ولگر کیٹیگری میں شمار ہوتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے تم اس سلسلے میں صرف جیکی کولن تک محدود رہو۔''

''یعنی چھوٹے چھوٹے پیراگرافس۔ کریکٹرز کی تعداد بے شمار۔ بہرحال استانی صاحبہ میں نے تمہارا مشورہ مان لیا ہے آئندہ یہ عنصر کم سے کم ہوگا۔ کیا کروں بچپن سے حسن پرست ہوں۔ ماما کہتی ہیں کہ میں صرف خوب صورت



گواہی

زویا اعجاز

رَب کا بھید پانے کا راستہ آسان تر ہوتا ہے... بس روح کو اس میں جھونکنا پڑتا ہے... پھر قربت کا احساس بڑھ جاتا ہے... لیکن ہر کوئی اس راستے کو اختیار نہیں کرتا... انسان بس اپنی مرضی... اپنی خواہش اور اپنی تمناؤں کے گرد ہی گھومتا رہتا ہے... وہ صرف من بھاتی خواہشات کا دائرہ بناتا ہے... اور اس میں قید ہو کے زندگی بتا دیتا ہے... اپنی فطرت اور طبیعت کے مطابق حسد اور جلن کی آگ میں جلتا ہے اور اسی میں جل کے تباہ ہو جاتا ہے... ایسے ہی کردار کی فطرت کے اعمال و افعال... جس نے دوسروں کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا...

کسی اسیر پرندے کی طرح زخم زخم ہو جانے والی زندگی کے آخری لمحات......

موبائل فون کی گھنٹی اکیسویں دفعہ بج کر بند ہوئی تھی۔ شانزہ کے مزاج پر جھنجلاہٹ طاری تھی۔

''کیا مصیبت ہے؟ لوگوں کو چین کیوں نہیں پڑتا؟ کالز پر کالز کیے جا رہے ہیں۔'' اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس قالین پر پٹخ دیا۔ فون کی سریلی گھنٹی بند ہوئی تو شانزہ نے گہری سانس لیتے ہوئے بستر کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ اس کے نقوش تنے ہوئے تھے۔ شانزہ لیاقت اڑتیس سال کی تھی لیکن دیکھنے میں وہ پینتالیس برس کی لگتی

تھی۔ بالوں کو ہلکے نیلے رنگ میں رنگتے ہوئے اس نے منفرد نظر آنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ آنکھیں موٹی اور پیشانی قدرے تنگ تھی۔ کانوں کو نصف درجن سے زائد بار چھدوا کر مختلف انداز کے سونے کے ٹاپس پہن رکھے تھے۔
بستر سے سر ٹکائے ابھی کچھ ہی منٹ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ اس نے غصے سے آنکھیں کھولیں اور کھا جانے والی نظروں سے فون کو دیکھا۔ اس بار کالر آئی ڈی مختلف تھی۔ اصولی طور پر تو جھنجلاہٹ کم ہونی چاہیے تھی لیکن موبائل میں موجود اس کے پسندیدہ سسٹم نے غم و غصہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ کالر کے نمبر کے ساتھ ایک تصویر بھی ظاہر ہو رہی تھی جس کی جھلک نے ہی اس کی تڑپ میں اضافہ کیا تھا۔ اس عورت کی عمر تو پینتیس سال تھی لیکن حقیقت میں وہ پچیس سال کی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بال، چہرہ اور لباس اس قدر بہترین تھے کہ ہر دیکھنے والی آنکھ بے ساختہ حسد میں مبتلا ہو جاتی۔
''اس عمر میں بھی ایسی فریش نیس...... خدا جانے کون سی چکی کا آٹا کھاتی ہے؟ شوہر بھی دو نمبر طریقوں سے ہی پیسے کماتا ہوگا جو یہ پارلروں میں لٹا کر اتنی فریش لگتی ہے۔''
وہ اپنا اصل غم وقتی طور پر بھول کر ایک نئے دکھ میں مبتلا ہوئی۔ ''شوہر نہ سہی باہر کوئی رکھا ہوگا اپنے خرچے پورے کرنے کے لیے۔'' اس کے ذہن میں خود کارانہ انداز میں ایک اور سوچ ابھری۔ بدگمانی، شک اور خود ساختہ انداز ے لگانا اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ گھنٹی بجنے کے بعد ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور دوبارہ اپنا غم منانے لگی۔ موبائل پر پیغام موصول ہونے کی گھنٹی بجی۔ اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر فون اٹھا لیا۔
''یہ سب میں کیا سُن رہی ہوں شانزے؟ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ لیکن کیسے؟ کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔''
شانزہ کا دماغ کھول اٹھا۔
''یا اللہ! میں کہاں چلی جاؤں؟ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ موت کیوں نہیں آ جاتی مجھے؟ یہ سب کچھ دیکھنے، سننے اور سہنے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''میرا دل بند ہو جائے گا آج۔'' اس نے سینہ کوبی کرتے ہوئے کہا۔ ''بند...... ہاں...... بند...... میں یہ منحوس موبائل بند کیوں نہیں کر دیتی۔ خواہ مخواہ یہ ٹینشن پالے کیوں بیٹھی ہوں؟'' اس نے خود کو کوسا اور فون آف کر دیا۔
اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو رواں ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ دونوں ٹانگوں کے گرد لپیٹے اور سر گھٹنوں میں دے کے بلکنے لگی۔
''یا اللہ! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ میں نے اس زندگی میں ایسا کیا گناہ کر دیا تھا کہ یہ سب دیکھ رہی ہوں۔ میرے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟'' اس آہ و زاری میں اذان کی آواز بھی سماعت میں گونجنے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی۔ وہ خود کار انداز میں اٹھی اور وضو کر کے جائے نماز پر جا کھڑی ہوئی۔ نماز پڑھتے ہوئے مختلف باتیں، سوچیں، منصوبے، گلے، شکوے، کامیابیاں، ناکامیاں، ملال اور حسرتیں مچلتی رہیں۔
''میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا اللہ جی؟ میرے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟ مجھے انصاف عطا فرما! میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں؟'' اس کی زبان سے کم و بیش یہی جملے برآمد ہوتے رہے۔ اگلے پندرہ منٹ میں اس کے بازو اور بدن شل ہو چکے تھے۔ وہ جائے نماز سے اٹھ کر بستر پر ڈھے گئی۔ اسے گہری اور پُرسکون نیند کی اشد ضرورت تھی۔ لیاقت ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون کرنے کا سوچا لیکن موبائل آن ہونے کی صورت میں مزید کالز کا تصور ہی ہولناک تھا۔ شانزہ نے اپنا ارادہ مؤخر کیا اور دراز سے اعصابی سکون کی دو گولیاں نکال کر پانی سے نگل لیں۔
کچھ دیر بعد اس کے اعصاب پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ذہن کسی معتدل رفتار سے جھولے میں جھولتا محسوس ہو رہا تھا۔ شانزہ کو اپنا وجود پانی میں تیرتا بھی محسوس ہوا۔ ان سب احساسات کے ساتھ سکون اور ہلکے پن کے جذبات بھی تھے۔ وہ کسی تاریک سرنگ میں سفر کر رہی تھی جس کے بارے میں اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ کس مقام پر اختتام پذیر ہوگی۔ یکدم وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے سامنے روشنی کا ایک بہت بڑا ماخذ دائرے کی صورت میں رقصاں تھا۔ روشنی کبھی سفید، سنہری اور سیاہی مائل روپ دھار لیتی۔ یہ بڑی انوکھی اور عجیب بات تھی کہ سیاہ رنگ سے خارج ہوتی شعاعیں بھی منفرد چمک لیے ہوئے تھیں۔ اس دائرے کے دہانے پر کھڑی شانزہ الجھن محسوس کرنے لگی۔ وہ قدم آگے بڑھا کر دائرے کے پار جانا چاہتی تھی لیکن دل میں دبی کوئی نامعلوم خلش اسے ایسا کرنے سے روک بھی رہی تھی۔ چند لمحے مزید آگے سرکے۔ غنودگی، کیف، سکون اور خود فراموشی کا احساس کچھ اور گہرا ہوا۔ دائرے کی روشنیاں کچھ اور دلفریب محسوس ہونے لگیں۔
''میں کہاں چلی آئی ہوں؟ باہر کیسے نکلوں گی؟'' وہ ہڑبڑا کر سوچنے لگی۔ اسی لمحے سرمئی غبار ایک دائرے میں

تریا چلتر

سرور اکرام

ہر کام کرنے کا ایک سلیقہ ہوتا ہے... طریقہ ہوتا ہے... یہی سلیقہ کام کو اختتام تک پہنچاتا ہے... ایسے ہی نوجوان کی دلچسپ کتھا... اُس نے اپنی ہوشیاری اور سلیقہ مندی سے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بنیادی اصول ازبر کر لیا تھا...

اس واردات کا قصہ جہاں سیر کو سوا سیر مل گیا تھا...

وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کا نام بھی بہت اچھا تھا۔ شہیر معصوم۔

معصوم اس کے باپ کا تخلّص تھا۔ وہ ایک شاعر تھے اور معصوم تخلص کرتے تھے۔ شہیر نے باپ کی موت کے بعد اپنا پورا نام شہیر معصوم رکھ لیا تھا۔ وہ تھا بھی معصوم سا۔ اس کے دوستوں نے دریافت کیا۔

''بھائی یہ تو معصوم کیوں ہو گیا ہے؟''

''اس لیے کہ ابا کی طرف سے تو کچھ ملا نہیں ہے تو میں



نے سوچا کہ کیوں نا ان کا تخلص ہی نام کے ساتھ لگا لوں۔ ایک تو شہیر معصوم سننے میں اچھا لگتا ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ مجھے سعادت مند سمجھنے لگے ہیں۔''

اس نے اچھی خاصی تعلیم بھی حاصل کرلی تھی لیکن ابھی تک اسے ڈھنگ کی جاب نہیں ملی تھی۔ وہ تلاش کرتے کرتے تنگ آچکا تھا۔

ایک دن اسی بھاگ دوڑ میں اس نے اپنے ایک جاننے والے منیر کو دیکھ لیا۔ منیر ایک مہنگے اسٹور سے کچھ خرید کر باہر نکل رہا تھا۔ شہیر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک سال پہلے تک منیر کی معاشی صورتِ حال بہت خراب تھی۔ اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہوتے تھے لیکن اب وہ مہنگے اسٹور سے خریداری کر رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے لباس بھی قیمتی پہن رکھا تھا۔

شہیر اس کو بہت دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ منیر اس کا محلہ چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر اور بھی حیران رہ گیا کہ منیر ایک طرف کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے اپنی جیب سے چابی نکالی تھی کہ شہیر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''منیر۔'' اس نے آواز دی۔

''ارے شہیر، تم؟'' منیر نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔

پھر دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

''یہ بتا کیا یہ گاڑی تیری ہے؟ یا کسی کا ڈرائیور ہو گیا ہے؟''

''ارے نہیں بھائی یہ میری گاڑی ہے۔ چل آ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' منیر نے اسے اپنے برابر کی سیٹ پر بٹھا لیا۔

''یار یہ سب کیا ہے؟'' شہیر نے راستے میں پوچھا۔ ''تیری تو حالت بہت خستہ ہوا کرتی تھی۔ اب کیسے بدل گئی؟''

''کہیں بیٹھ تو جائیں، پھر بتاتا ہوں۔''

منیر اسے لے کر ایک ہوٹل آ گیا۔ پھر اس نے چائے اور دیگر چیزوں کا آرڈر دیا۔ پھر چائے پینے کے دوران منیر نے بتایا۔ ''یار تو تو جانتا ہے کہ میں نے پرانا محلہ چھوڑ دیا ہے۔''

''ہاں، مگر تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟''

''میں ایک اچھی جگہ شفٹ ہو گیا ہوں۔'' منیر نے بتایا۔

''لیکن کیسے؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟''

''یار تجھے تو معلوم ہے کہ میں جاب کے لیے کتنا خوار ہوتا رہا ہوں۔ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ پورے گھر کا خرچ میرے ذمے تھا اور جاب ہی نہیں مل رہی تھی۔ کبھی کبھی تو خیال آتا کہ خودکشی کرلوں تاکہ جان چھوٹے۔ اسی مایوسی کے عالم میں ایک بندے نے مجھے استاد سامری سے ملوا دیا۔''

''استاد سامری؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔ ''یار سامری تو ایک جادوگر کا نام تھا۔''

''ہاں استاد سامری بھی جادوگر ہی ہیں۔ وہ اپنے مشوروں سے قسمت بدل دیتے ہیں۔ مجھے دیکھ، میں کیا سے کیا ہو گیا ہوں۔ کیا نہیں ہے میرے پاس؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بات ابھی بھی سمجھ میں نہیں آئی۔'' شہیر نے کہا۔ ''کیا مشورہ دے دیا استاد سامری نے۔''

''تو ایسا کر اگر فرصت ہو تو میرے ساتھ چل۔'' منیر نے کہا۔

''میرے پاس فرصت کے علاوہ اور ہے کیا؟''

''کیا کہیں جاب نہیں ملی؟''

''اگر جاب ملتی تو اتنی خستہ حالت کیوں ہوتی؟'' شہیر نے کہا۔ ''لیکن تمہیں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے، یہ سب کیسے ہوا؟''

''شہیر، یہ سب میرے استاد سامری کا کمال ہے۔ انہوں نے میری دنیا بدل دی ہے۔''

''کون ہیں تمہارے استاد؟ کیا کیا ہے انہوں نے تمہارے ساتھ؟''

''وہ تمہاری بھی دنیا بدل سکتے ہیں اگر تم نے ان کی باتوں پر عمل کیا تو۔ ایک بات بتا دوں۔ ان کا اصل نام ہے خوش قسمت خان۔ سامری ہم پیار سے کہتے ہیں۔ تم انکار مت کرنا۔''

''کیوں نہیں؟'' شہیر جلدی سے بول پڑا۔ ''جو میری حالت ہو رہی ہے اگر کوئی دریا میں بھی کود جانے کو کہے تو کود جاؤں گا۔''

''تو پھر ابھی چلو۔ میں تمہیں اپنے استاد سے ملواتا ہوں۔''

''ہوٹل کا بل ادا کر کے وہ باہر آ گئے۔ منیر نے شہیر کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے استاد خوش قسمت خان کمال کے آدمی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی سختیوں سے سبق سیکھا ہے اور ان سے فائدہ اٹھا کر آج وہ ایک کامیاب انسان ثابت ہو رہے ہیں۔''

جب شہیر نے گاڑی ایک شاندار مکان کے گیٹ پر روکی تو شہیر حیران رہ گیا۔ ''یار یہ کس کا مکان ہے؟''

زندہ راکھ

غلام قادر

کیا یقیں اور کیا گماں چُپ رہ
ہو گیا قصۂ وجود تمام
ہے اب آغازِ داستاں چُپ رہ

دشمنوں کی بھیڑ میں کہیں ایک دوستی کا ہاتھ ضرور چھپا ہوتا ہے... جو وقت پڑنے پر اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے... اور ایسے تھامتا ہے کہ اپنی زندگی ہار دیتا ہے... مگر دوستی کی ذمّے داری پر آنچ نہیں آنے دیتا... وقت گزر چکا تھا... ماضی کے قصے بظاہر سرد راکھ بن چکے تھے... لیکن اس کے نیچے دبی دبی چنگاریاں اب بھی سُلگ رہی تھیں... ایسے ہی ماحول سے تعلق رکھتی تحریر کے اُتار چڑھائو... جہاں برسوں بعد بھی بدلہ لینے کی روایات برقرار رہتی تھیں... اپنے ہی خون سے ہاتھ رنگنا ان کے خاندان کی رسم سمجھی جاتی تھی... دل گداز داستاں کے مختلف ادوار...

طویل قلمی جمود کے بعد آپ کے محبوب مصنف کی ایک پُرتجسس کہانی کے ہمراہ حاضری

پیغام بہت واضح تھا لیکن میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈرتے ڈرتے پیغام پر دیا ہوا فون نمبر ملایا لیکن فون بند تھا۔ تین بار فون پر ایک ہی جواب ملنے کے بعد میں نے اس نمبر پر میسج کرنا مناسب سمجھا۔

''تم کون ہو؟'' میسج کرنے کے بعد میں نے جواب کا انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو میں نے پھر سے پیغام پڑھنا شروع کر دیا۔

''ڈیئر سلمان...... اتوار کی شام 5 بجے میں اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہوں۔ تم اگر اس میں شرکت کرو تو یہ میرے لیے اعزاز ہوگا، اُمید ہے کہ تم ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ میں تکلف نہیں کرو گے۔''

بار بار پیغام پڑھنے کے باوجود میں صرف اتنا سمجھ سکا تھا کہ پیغام بھیجنے والی کوئی خاتون ہیں اور نیویارک کے دیے ہوئے ایڈریس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نیویارک میں مقیم ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میری پریشانی کی وجہ بہت سی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ محترمہ میرے اس نام سے واقف تھیں جسے ترک کیے مجھے عرصہ ہو چکا تھا۔ دوسری یہ کہ پیغام اُردو میں تھا یعنی وہ یہ جانتی تھی کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے، جبکہ میری ان دستاویزات کے مطابق جس کے تحت میں امریکا میں تھا، میرا تعلق ترکی سے تھا۔ سوم یہ بھی کہ وہ جانتی تھی کہ میں نیوجرسی میں جہاں مقیم ہوں، وہاں سے اس کے پتے کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کا تھا۔

بہت دیر سوچنے کے بعد جب کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تو میں نے فیصلہ کیا کہ دو دن بعد جانے کے بجائے میں اسی روز اس پتے پر پہنچ جاؤں لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ جمعہ اور ہفتہ وہ دو دن ہوتے تھے جب ریسٹورنٹ میں رش سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ اس میں دوسری مجبوری یہ تھی کہ ٹرکش اور پاکستانی کھانوں کے بعد میں نے ایک ماہ پہلے افغانی کھانوں کی ابتدا کی تھی۔ نہیں

چاہتا تھا کہ میرے گاہکوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ملے۔ گاہک کی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ براہِ راست مالک سے شکایت کرے اور مالک شکایت دور کرنے کا وعدہ کر لے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

''کون ہو سکتی ہے؟'' میرا خیال ایک بار پھر پیغام کی جانب چلا گیا مگر پہلے کی طرح اس بار بھی مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

''شاید مجھے اپنا یہ جمایا کاروبار چھوڑ کر پھر آوارہ گردی کرنا پڑے۔'' ایک خیال ذہن میں آیا اور اس خیال کے آتے ہی میں وہ وقت یاد کرنے لگا جب مجھے اپنا شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ میں سمندر کے راستے غیر قانونی طور پر دبئی اور وہاں سے قطر اور پھر قطر سے استنبول آیا تھا۔ وہاں سال بھر گزارنے کے بعد جب میرے جعلی سفری کاغذات بن گئے تو میں امریکا آ گیا۔ یہاں بھی براہِ راست نیوجرسی آنے کے بجائے میں پہلے نیویارک اور ٹیکساس جیسے معروف شہروں میں رہا اور پھر اس کم آبادی والے شہر میں آ بسا لیکن اس پیغام کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب مجھے یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑے گا۔

''مجھے پیغام بھیجنے والی کا کوئی تعلق شہناز یا اس کے ورثا سے تو نہیں ہو سکتا۔'' ایک خیال میرے ذہن میں آیا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس کی تردید بھی کر دی۔

''شہناز کے قتل کو بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس کے بھائی بھی نہ جانے کب کے مر کھپ گئے ہوں گے۔ ان کی اولاد اگر اپنے باپ دادا کے پیشے میں آئے بھی ہوں گے تو انہیں اتنی دلچسپی نہیں ہو گی۔'' میں مسلسل سوچتا رہا اور اپنے خیالات کی خود ہی تردید کرتا رہا۔

''انہیں اپنی پھوپی کی موت سے دلچسپی نہ بھی ہو اس رقم سے تو یقیناً دلچسپی ہو گی جو تم وہاں سے لے کر فرار ہوئے





پیمانۂ وفا

محمد یاسر اعوان

وقت کے نشتر بڑے ظالم ہوتے ہیں... ایک ہی وار میں کام تمام کر جاتے ہیں... وقت و حالات کے آہنی شکنجے میں جکڑے ایسے ہی نوجوان کی دل دوز کہانی... جو اپنی آزادی کی زندگی ختم کرکے اسیری میں دن بِتا رہا تھا... جب زنداں سے پروانۂ آزادی ملا تو ایک نئے امتحان نے اسے اپنے حصار میں لے لیا... جھوٹ اور خوشامدی معاشرے میں جہاں سچائی مصلوب ہو رہی تھی... وہ اپنی جنگ کی تیاری کر رہا تھا...

دو دوستوں کے درمیان طے پا جانے والے معاہدے کا عہدنامہ

اندھیرا بڑھنے لگا تھا لیکن وہ ابھی تک جیل کے دائیں جانب والے لان میں بیٹھا گہری سوچوں میں گم، ماضی کی تلخ یادوں میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں کسی کے قدموں کی آواز ابھری۔ دونوں آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اُس کی قوتِ سماعت خاصی تیز تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو دوست؟'' آنے والے نے کہا۔

اُس نے آواز کی طرف کان لگائے اور آنے والے

کے بارے میں اندازہ کرنے لگا۔ آواز اجنبی سی تھی۔ اس کے جھلسے چہرے اور بے نور آنکھوں میں ساری دنیا کی اداسیاں سمٹ آئی تھیں۔ ''آپ کون ہو؟'' اندھے نے پوچھا۔ ''اس وقت تو جیل میں کھانے کا وقت ہو چکا ہے اور تم اس اندھیرے میں یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ تصویرِ حیرت بنا آنے والے کی جانب نظریں جمائے ہوئے تھا۔ حالانکہ وہ بینائی سے محروم تھا۔

''میں انور علی ہوں، اسی جیل کا قیدی ہوں دوست، تین نمبر بیرک سے آیا ہوں۔'' انور نے اندھے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اندھے نے کندھے پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ وہ ایک مضبوط اور بھاری ہاتھ تھا۔ ''آنکھیں بڑی نعمت ہیں دوست۔'' اندھے نے کہا اور اس کی بے نور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''حوصلہ کرو برادر! جو آنکھیں لیتا ہے وہ دینے پر بھی قادر ہے۔'' انور نے کہا۔ ''ممکن ہے تمہیں اس سے بھی اچھی آنکھیں مل جائیں۔''

اندھے قیدی نے اپنا تاریک اور بے نور چہرہ اوپر اٹھایا اور انور کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی گرفت بڑی جاندار تھی۔

''اندھے سے مذاق کرتا ہے ظالم! میں...... میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ مجھے کمزور نہ سمجھنا۔ نابینا ضرور ہوں لیکن کمزور نہیں ہوں، آئندہ کسی اندھے سے مذاق نہ کرنا۔ میں بچپن سے ہی نابینا ہوں...... مجھے کون دے گا آنکھیں؟''

''میں دوں گا تمہیں اپنی آنکھیں۔'' انور نے کہا۔

اندھے نے انور کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کی طرف منہ کر کے بولا۔ ''بیٹا! لگتا ہے کسی اچھے خاندان سے تعلق ہے تیرا...... کس سلسلے میں جیل کاٹ رہا ہے؟''

''میرا نام انور ہے بزرگو! میں آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی جیل میں ہوں اور آپ بغیر آنکھوں کے جیل میں ہو۔'' انور بولا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا اور نہ جرم...... آپ کس جرم کی پاداش میں یہاں پہنچے؟''

☆☆☆

''میرا نام الیاس ملک ہے...... میرا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ میرے والدین حیات ہیں۔ ایک تو میری بدقسمتی کہ میں بچپن سے ہی نابینا ہوں، پیدائش سے لے کر میرے جوان ہونے تک میرے والدین نے میرا بہت علاج کروایا لیکن میری آنکھوں کی بینائی بحال نہ ہو سکی۔ دوسری بدقسمتی یہ ہوئی کہ مجھ سے قتل جیسا گھناؤنا جرم سرزد ہو گیا، مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ چند دن ہی ہوئے ہیں، میں ملتان جیل سے یہاں لایا گیا ہوں۔ مجھے سزائے موت ہوئی مگر اپیل پر اس سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی پوری ہونے والی ہے...... چھ ماہ بعد میں رہا ہو جاؤں گا۔''

الیاس نے اپنی مختصری رُوداد سنائی اور خاموش ہو گیا۔

''قتل جیسا جرم تو مجھ سے بھی ہوا لیکن...... ابھی وقت کافی ہو چکا ہے اور جیل حکام حاضری پر ہمیں نہ پا کر اس طرف آنکلیں گے۔ کل شام یہیں آپ سے ملاقات ہو گی۔ میں نے آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے۔ کل شام پانچ بجے یہیں اسی لان میں، میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' انور کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ الیاس بھی اٹھ کر اپنا بیرک کی جانب چلا گیا۔ انور نے اسے سوچوں کی گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا۔ ''میں دوں گا آنکھیں، اگر آپ کو آنکھیں مل جائیں تو کیسا رہے؟'' انور کی ان باتوں نے اس کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ پوری رات نہ سو سکا۔ فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں اور الیاس ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کی سوچیں آنکھوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ اس نوجوان انور کے بارے میں بھی سوچتا رہا جو اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔ الیاس نے فجر کی نماز ادا کی اور اپنے رب سے بے شمار دعائیں مانگتا رہا۔ آج اس نے جیل سے ناشتا نہیں کیا، بلکہ جیل کی کینٹین سے اسپیشل قسم کے چند لوازمات منگوا کر کھائے۔ تھوڑی نیند لینے کے بعد وہ اٹھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر دوبارہ بستر میں گھس گیا۔ کیونکہ جیل کی طرف سے اس پر کوئی سختی نہیں کی جاتی تھی، نہ ہی جسمانی مشقت کرائی جاتی۔ چونکہ وہ نابینا قیدی تھا اس لیے اسے کافی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ ملتان جیل میں الیاس کے والدین کے علاوہ اس کے چچا ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی ریشماں بھی آتی رہی تھی لیکن پھر اچانک ہی اس کا آنا بند ہو گیا۔ الیاس نے بھی اس بارے میں کسی سے نہ پوچھا۔

اب جب وہ ملتان سے بہاول پور جیل میں منتقل ہوا تو گھر سے ابھی تک کوئی بھی فرد ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا۔

ہزاروں وسوسے سر اٹھائے کھڑے ہو گئے۔ ممکن ہے ریشماں کو کچھ ہو گیا ہو؟ یا اس کی شادی کر دی گئی ہو، وغیرہ وغیرہ...... انہی خیالات کی رو میں بہتے بہتے وہ ماضی میں چلا گیا۔ تب وہ ایک کھلنڈرا سا نوجوان تھا۔ والدین کا اکلوتا لاڈلا۔ چھ فٹ قد، مضبوط اعصاب، گندمی رنگت، چوڑی چھاتی، وہ بہت خوب صورت تھا لیکن بینائی سے